منٹو کی ۲۰ بیس کہانیاں

ڈاکٹر اے۔ بی اشرف * ڈاکٹر انوار احمد

حُرّیتِ فکر کے نام

ترتیب

۳۔ تخلیق کی روشنی میں

حرفِ اوّل

اُردو کہانی کی تاریخ میں دُوسرا منٹو ابھی تک پیدا نہیں ہُوا۔ کیُونکہ سب سے زیادہ اُسی کو پڑھا گیا اور سب سے زیادہ اُسی کو کوسا گیا۔ دراصل ہماری معاشرتی تحریمات کے ساتھ المیہ یہ پیش آیا ہے کہ یہ تضادات اور منافقت کی بنیادوں پر استوار ہُوئی ہیں۔ نظری اور تصوّری سطح پر بلند معیاری اور اخلاقی ترفع کا دعویٰ مگر عملی طور پر بداعمالیوں کی انتہا کا مظاہرہ!

یہ تضاد ہمارے سماج کی گھٹی میں پڑ چکا ہے اور اس تضاد نے افرادِ معاشرہ کی سائیکی کو بھی اس نہج پر ڈال دیا ہے۔ منٹو ان منافقانہ معاشرتی تحریمات اور ان کی بدولت وجُود آنے والی سائیکی کا ایک بے باک تجزیہ نگار اور ناقد ہے۔ یُوں اُس کی کہانیاں ہمارے اجتماعی لاشعُور کو سامنے لاتی ہیں۔

ہم نے منٹو کی سینکڑوں کہانیوں میں سے صرف بیس منتخب کی ہیں اور ان کو عموماً زمانی لحاظ سے ترتیب دیا ہے۔ ابتدائی کہانی سے آخری دَور کی اُس کہانی تک جو آنے والی کہانی کے اسلوب اور فن کا اشاریہ بنی ——— !!

یہ کہانیاں نہ صرف منٹو کے موضوعاتی تنوع اور وسعت کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ اُس کے فنی ارتقاء کی داستان بھی سناتی ہیں۔ اس مجموعے کی کہانیوں کو ہم نے نہ تو بہترین کہانیاں کہا

ہے نہ نمائندہ کہانیاں اور نہ منتخب کہانیاں کیونکہ یہ سب صفات انفرادی پسند و ناپسند کے معیار کا پیمانہ ہوتی ہیں۔ اِس لئے ہم نے ان کو محض "منٹو کی بیس کہانیاں" کہا ہے۔ یہ ہماری پسند کی کہانیاں ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں ہماری پسند کے بے شمار دوسرے افسانے بھی موجود ہیں۔ لیکن ایک کتاب کی ضخامت کے لیے ہم نے انہی کہانیوں کو کافی سمجھا۔ کسی فنکار کے فن کے مکمل عرفان اور ادراک کے لیے اُس کی جملہ تخلیقات کا تدریجی مطالعہ ضروری ہے لیکن اس بھاگتی ہوئی تیز رفتار دُنیا میں اب اِنتخاب کی اہمیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ اس اِنتخاب کا ایک مقصد منٹو شناسی اور منٹو شناسائی ہے۔

منٹو کا اجمالی سوانحی خاکہ مرتّب کر دیا گیا ہے۔ ذہین قاری اس اشاراتی خلکے میں خود رنگ بھر سکتا ہے۔ منٹو کی ان بیس کہانیوں پر ایک تجزیاتی مطالعہ بھی شامل ہے اور منٹو کے فن پر ایک مجموعی محاکمہ بھی درج کیا گیا ہے۔ تاکہ اس مجموعے کا قاری منٹو کی اِن بیس کہانیوں کے مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کہانیوں کی تفہیم اور منٹو کے فن کو بحیثیت مجموعی دیکھنے اور سمجھنے کی ایک ابتدائی کوشش کو بھی یکجا پائے۔

جناب عُمر خاں (کاروانِ ادب کے میرِ کارواں) کے حوصلے، استقامت اور جرأت کی داد نہ دینا ناانصافی ہے۔ مُلتان میں وہ واحد باہمت پبلشر ہیں جو کسی ذاتی مفاد کی پرواہ کیے بغیر ملتان کے اہلِ قلم کی کاوشوں کو منظرِ عام پر لا رہے ہیں اور بڑے تسلسل کے ساتھ ــــ منٹو کی کہانیوں کو شائع کرنے کا شوق صرف ہم دونوں کو ہی نہ تھا بلکہ حقیقتاً اس کی تحریک خان صاحب نے ہی دی ہے۔ اِس کتاب کے حُسن کا کریڈٹ اُن کو جاتا ہے اور خامیاں ہم اپنے ذمے لیتے ہیں۔

احمد بختیار اشرف
انوار احمد

سعادت حسن منٹو — ایک سوانحی خاکہ

مرتب۔ ڈاکٹر انوار احمد

منٹو ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو سمبرالہ ضلع لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ والد میاں غلام حسن، منصف کے عہدے پر فائز تھے، منٹو کی والدہ، میاں صاحب کی دوسری بیوی تھیں اور یہ شادی اس وقت ہوئی جب اُن کی پہلی بیوی حیات تھیں اور ان کی اولاد جوان — تین برس فیل ہونے کے بعد منٹو نے ۱۹۳۱ء میں میٹرک کر لیا، پہلے ہندو سبھا کالج امرتسر میں داخلہ لیا، پھر ایم۔ اے۔ او کالج میں انٹر کے طالب علم کی حیثیت سے پہنچے، جہاں صاحبزادہ محمود الظفر، فیض احمد فیض، اختر حسین رائے پوری اور ڈاکٹر تاثیر (انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی ارکان) پڑھا رہے تھے، ۱۹۳۲ء میں منٹو کے والد نے وفات پائی، ۱۹۳۵ء میں انٹر کئے بغیر منٹو علی گڑھ یونیورسٹی پہنچے، مگر چند ماہ بعد یونیورسٹی سے نکال دیئے گئے۔ عام روایت کے مطابق اِن کے سینے میں تپ دق کے اثرات پل رہے تھے، مگر سجاد شیخ نے جنوری ۱۹۸۰ء کے 'ویو پوائنٹ' لاہور، میں خیال ظاہر کیا ہے کہ منٹو کو اس کے انقلابی اور نظام دشمن رویے کی وجہ سے نکالا گیا، کیونکہ کچھ عرصے بعد علی سردار جعفری کو بھی اسی جرم میں یونیورسٹی سے نکال دیا گیا، ۱۹۳۲ء کے ہمایوں میں منٹو کا پہلا افسانوی ترجمہ 'دست بریدہ بھوت' شائع ہوا (ابو سعید قریشی)، ۱۹۳۴ء کے اواخر میں باری علیگ نے اپنا ہفتہ وار پرچہ 'خلق' امرتسر سے جاری کیا (جس کے دو شمارے شائع ہو سکے) منٹو کا اولین افسانہ 'تماشا' اسی میں فرضی نام (آدم) سے شائع ہوا' اس کے بعد 'عالمگیر' میں شائع ہوا — اس سے ایک برس پہلے باری

کی ہدایت پر منٹو، وکٹر ہیوگو کے ناول THE LAST DAYS OF CONDEMNED کا ترجمہ ' سرگزشتِ اسیر' کے نام سے کر چکے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں انہوں نے آسکر وائلڈ کے اشتراکی نظریات کے حامل ڈرامے 'ویرا' کا ترجمہ کیا، ۱۹۳۵-۳۶ء میں چیخوف' کے دو ڈراموں کے تراجم کتابی شکل میں شائع ہوئے، مئی ۱۹۳۵ء میں 'ہمایوں' کے مدیر حامد علی خان کے تعاون سے 'روسی ادب نمبر' مرتب کیا اور اس کے بعد 'روسی افسانے' شائع کی، ۱۹۳۶ء کے اوائل میں منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ 'آتش پارے' شائع ہوا' اسی برس انہوں نے 'عالمگیر' کا روسی ادب نمبر شائع کیا، ۱۹۳۹ء میں شادی ہوئی، دہلی ریڈیو اسٹیشن، مصور کی ادارت اور بمبئی کی فلمی صنعت سے وابستہ رہے' تین بیٹیاں پیدا ہوئیں (نگہت، نزہت اور نصرت) بیٹا (عارف) چھوٹی عمر ہی میں چل بسا' قیام پاکستان کے بعد جنوری ۱۹۴۸ء میں پاکستان پہنچے، لاہور میں مقیم ہوئے، حسن عسکری کے ساتھ مل کر 'اردو ادب' جاری کیا، مگر دو شمارے ہی نکل سکے، منٹو کے چھ افسانوں پر مقدمے چلے، 'دھواں' 'بو' 'کالی شلوار' 'ٹھنڈا گوشت' 'کھول دو' 'اوپر نیچے اور درمیان'— ریڈیو پاکستان اور انجمن ترقی پسند مصنفین (رجسٹرڈ) نے پابندی عائد کر دی' دو مرتبہ ذہنی شفاخانے میں رہے، عصمت چغتائی کے مطابق (نقوش منٹو نمبر) منٹو نے انہیں دو مرتبہ لکھا تھا کہ بھارت بلوا لو' —— ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء کو مرتے وقت اپنی بیوی صفیہ سے کہا 'اب یہ ذلت ختم ہو جانی چاہیئے' —— منٹو نے اپنے لیئے یہ کتبہ بھی تجویز کیا تھا "یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے' اس کے سینے میں افسانہ نگاری کے سارے اسرار دفن ہیں' وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا"

تصانیف

(۱) ۱۔ منٹو کے ڈرامے ۲۔ آؤ (ڈرامے) ۳۔ کروٹ (ڈرامے) ۴۔ عورتیں (ڈرامے) ۵۔ بغیر عنوان کے (ناول) ۶۔ لاؤڈ سپیکر (خاکے) ۷۔ گنجے فرشتے (خاکے) ۸۔ عصمت چغتائی (خاکہ) ۹۔ نورجہاں سرورِ جہاں (خاکہ) ۱۰۔ تلخ ترش اور شیریں (طنزیہ مضامین) ۱۱۔ منٹو کے مضامین ۱۲۔ کتاری (فلمی کہانی) ۱۳۔ منٹو کے خطوط مرتبہ احمد ندیم قاسمی۔

(ب) ۱۔ سیاہ حاشیے ۲۔ اُوپر نیچے اور درمیان ۳۔ جنازے ۴۔ برقعے (ان میں افسانوی اجزا، موجُود ہیں)

افسانوی مجموُعے

(ج) ۱۔ آتش پارے ۲۔ منٹو کے افسانے ۳۔ دھواں، ۴۔ لذتِ سنگ، (قیام پاکستان سے پہلے یہ چاروں مجموُعے شائع ہوُئے) ۵ چغد ۶۔ ٹھنڈا گوشت، ۷۔ بادشاہت کا خاتمہ، ۸۔ یزید، ۹۔ خالی بوتلیں خالی ڈبے، ۱۰۔ نمرود کی خُدائی، ۱۱۔ سڑک کے کنارے ۱۲۔ سرکنڈوں کے پیچھے، ۱۳۔ پھندنے، ۱۴۔ رتی، ماشہ، تولہ، ۱۵۔ انار کلی، ۱۶۔ شکاری عورتیں ۱۷۔ ایک مرد۔

"میں ایسی دُنیا پر، ایسے مہذّب ملک پر، ایسے مہذّب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں جہاں یہ اصُول مروّج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخّص لانڈری میں بھیج دیا جائے، جہاں سے وہ دُھل دُھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔"

(گنجے فرشتے)

تماشا

دو تین روز سے طیارے سیاہ عقابوں کی طرح پَر پھیلائے خاموش فضا میں منڈلا رہے تھے۔ جیسے وہ کسی شکار کی جستجو میں ہوں۔ سُرخ آندھیاں وقتاً فوقتاً کسی آنے والے خونی حادثہ کا پیغام لا رہی تھیں۔ سنسان بازاروں میں مسلح پولیس کی گشت ایک عجیب ہیبت ناک سماں پیش کر رہی تھی۔ وہ بازار جو صُبح سے کچُھ عرصہ پہلے لوگوں کے ہجُوم سے پُر ہُوا کرتے تھے اب کسی نامعلُوم خوف کی وجہ سے سُونے پڑے تھے ــــــ شہر کی فضا پر ایک پُر اسرار خاموشی مسلط تھی۔ بھیانک خوف راج کر رہا تھا۔

خالد گھر کی خاموش و پُرسکون فضا سے سہما ہُوا اپنے والد کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

"ابا، آپ مجُھے سکول کیُوں نہیں جانے دیتے"؟

"بیٹا۔ آج سکول میں چھُٹی ہے"۔

"ماسٹر صاحب نے تو ہمیں بتایا ہی نہیں۔ وہ تو کل کہہ رہے تھے کہ جو لڑکا آج سکول کا کام ختم کر کے اپنی کاپی نہ دکھلائے گا۔ اُسے سخت سزا دی جائے گی"!

"وہ اطلاع دینی بھُول گئے ہوں گے"۔

"آپ کے دفتر میں بھی چھُٹی ہو گی"؟

"ہاں ہمارا دفتر بھی آج بند ہے۔"

"چلو اچھا ہُوا ——— آج میں آپ سے کوئی اچھی سی کہانی سنوں گا۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ تین چار طیارے چیختے ہُوئے اُن کے سر پر سے گُزر گئے۔ خالد اُن کو دیکھ کر بہت خوفزدہ ہُوا، وہ تین چار روز سے ان طیاروں کی پرواز کو بغور دیکھ رہا تھا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تھا۔ وہ حیران تھا کہ یہ جہاز سارا دن دُھوپ میں کیوں چکّر لگاتے رہتے ہیں۔ وُہ اُن کی روزانہ نقل و حرکت سے تنگ آ کر بولا۔

"ابا۔ مجُھے ان جہازوں سے سخت خوف معلوم ہو رہا ہے۔ آپ اُن کے چلانے والوں سے کہہ دیں کہ وہ ہمارے گھر پر سے نہ گُذرا کریں۔"

"خوف! ——— کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے خالد۔"

"ابا، یہ جہاز بہت خوفناک ہیں۔ آپ نہیں جانتے، یہ کسی نہ کسی روز ہمارے گھر پر گولہ پھینک دیں گے ——— کل صُبح ماما امّی جان سے کہہ رہی تھی۔ کہ ان جہاز والوں کے پاس بہت سے گولے ہیں۔ اگر اُنہوں نے اس قسم کی کوئی شرارت کی، تو یاد رکھیں میرے پاس بھی ایک بندوق ہے ——— وہی جو آپ نے پچھلی عید پر مجُھے دی تھی۔"

خالد کا باپ اپنے لڑکے کی غیر معمولی جسارت پر ہنسا۔ "ماما تو پاگل ہے، میں اس سے دریافت کروں گا۔ کہ وہ گھر میں ایسی باتیں کیوں کرتی ہے ——— اطمینان رکھو، وہ ایسی بات ہرگز نہیں کریں گے۔"

اپنے والد سے رُخصت ہو کر خالد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور ہوائی بندوق نکال کر نشانہ لگانے کی مشق کرنے لگا۔ تاکہ اس روز جب ہوائی جہاز والے گولے پھینکیں تو اس کا نشانہ خطا نہ جائے اور وہ پُوری طرح انتقام لے سکے ——— کاش! اِنتقام کا یہی ننھا جذبہ ہر شخص میں تقسیم ہو جائے۔

اسی عرصے میں جب ایک ننھا بچہ اپنے انتقام لینے کی فکر میں ڈوبا ہُوا طرح طرح

کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ گھر کے دوسرے حصّے میں خالد کا باپ اپنی بیوی کے پاس بیٹھا ہُوا ماما کو ہدایت کر رہا تھا۔ کہ وہ آئندہ گھر میں اس قسم کی کوئی بات نہ کرے۔ جس سے خالد کو دہشت ہو۔

ماما اور بیوی کو اسی قسم کی مزید ہدایات دے کر وہ ابھی بڑے دروازے سے باہر جا رہا تھا۔ کہ خادم ایک دہشت ناک خبر لایا۔ کہ شہر کے لوگ بادشاہ کے منع کرنے پر بھی شام کے قریب ایک عام جلسہ کرنے والے ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش آکر رہے گا۔

خالد کا باپ یہ خبر سُن کر بہت خوفزدہ ہُوا۔ اب اُسے یقین ہو گیا۔ کہ فضا کا غیر معمولی سکُون۔ طیاروں کی پرواز، بازاروں میں مسلّح پولیس کی گشت لوگوں کے چہروں پر اُداسی کا عالم اور خُونی آندھیوں کی آمد کسی خوفناک حادثہ کا پیش خیمہ تھے۔

وہ حادثہ کس نوعیت کا ہو گا؟ ـــــــ یہ خالد کے باپ کی طرح کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ مگر پھر بھی سارا شہر کسی نامعلوم خوف میں لپٹا ہُوا تھا۔

باہر جانے کے خیال کو ملتوی کر کے خالد کا باپ ابھی کپڑے تبدیل کرنے بھی نہ پایا تھا کہ طیاروں کا شور بلند ہُوا۔ وہ سہم گیا ـــــــ اُسے ایسا معلوم ہُوا، جیسے سینکڑوں انسان ہم آہنگ آوازمیں درد کی شدّت سے کراہ رہے ہیں۔

خالد طیّاروں کا شور سُن کر اپنی ہوائی بندوق سنبھالتا ہُوا کمرے سے باہر دوڑ آیا۔ اور اُنہیں غور سے دیکھنے لگا۔ تاکہ وہ جس وقت گولے پھینکنے لگیں۔ تو اپنی ہوائی بندوق کی مدد سے اُنہیں نیچے گرا دے ـــــــ اس وقت چھ سال کے بچے کے چہرے پر آہنی ارادہ و استقلال کے آثار نمایاں تھے۔ جو کہ حقیقت بندوق کا کھلونا ہاتھ میں تھامے ایک جرّی سپاہی کو شرمندہ کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آج اُس چیز کو جو اُسے عرصے سے خوفزدہ کر رہی تھی۔ مٹانے پر تُلا ہُوا ہے۔

خالد کے دیکھتے دیکھتے ایک جہاز سے کچھ چیز گری۔ جو کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے مشابہ تھی۔ گرتے ہی یہ ٹکڑے ہوا میں پتنگوں کی طرح اُڑنے لگے۔ ان میں سے چند خالد

کے مکان کی بالائی چھت پر بھی گرے۔

خالد بھاگا ہُوا اُوپر گیا۔ اور وہ کاغذ اٹھا لایا۔

" اباجی ـــــ ماما سچ مچ جھُوٹ بک رہی تھی۔ جہاز والوں نے تو گولوں کی بجائے یہ کاغذ پھینکے ہیں۔"

خالد کے باپ نے وہ کاغذ لے کر پڑھنا شرُوع کیا۔ تو رنگ زرد ہو گیا ـــــ ہونے والے حادثے کی تصویر اب اُسے عیاں طور پر نظر آنے لگی۔ اُس اشتہار میں صاف لکھا تھا۔ کہ بادشاہ کسی جلسہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اگر اُس کی مرضی کے خلاف کوئی جلسہ کیا گیا تو نتائج کی ذمہ دار خُود رعایا ہو گی۔

اپنے والد کو اشتہار پڑھنے کے بعد اس قدر حیران و پریشان دیکھ کر خالد نے گھبراتے ہُوئے کہا۔" اس کاغذ میں یہ تو نہیں لکھا۔ کہ وہ ہمارے گھر پر گولے پھینکیں گے"۔؟

" خالد، اس وقت تُم جاؤ! ـــــ جاؤ اپنی بندوق کے ساتھ کھیلو!

" مگر اس پر لکھا کیا ہے۔"؟

" لکھا ہے کہ آج شام کو ایک تماشا ہو گا۔" خالد کے باپ نے گفتگو کو مزید طول دینے کے خوف سے جھُوٹ بولتے ہُوئے کہا۔

تماشا ہو گا! ـــــ پھر تو ہم بھی چلیں گے نا۔"؟

" کیا کہا؟

کیا اس تماشے میں آپ مجھے نہ لے چلیں گے"؟

" لے چلیں گے! ـــــ اب جاؤ جا کر کھیلو۔"

" کہاں کھیلوں؟ ـــــ بازار میں آپ جانے نہیں دیتے۔ ماما مجھ سے کھیلتی نہیں، میرا ہم جماعت طفیل بھی تو آج کل یہاں نہیں آتا۔ اب میں کھیلوں تو کس سے کھیلوں؟ ــ ــ

شام کے وقت تماشا دیکھنے تو ضرور چلیں گے نا؟"

کسی جواب کا انتظار کئے بغیر خالد کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور مختلف کمروں میں آوارہ پھرتا ہُوا اپنے والد کی نشست گاہ میں پہنچا۔ جس کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب بیٹھ کر وُہ بازار کی طرف جھانکنے لگا۔

کیا دیکھتا ہے کہ بازار میں دکانیں تو بند ہیں۔ مگر آمد و رفت جاری ہے ——— لوگ جلسے میں شریک ہونے کے لیئے جا رہے تھے۔ وہ سخت حیران تھا۔ کہ دو تین روز سے دُکانیں کیوں بند رہتی ہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لیئے اس نے اپنے ننھے دماغ پر بہتیرا زور دیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔

بہت غور و فکر کے بعد اُس نے یہ سوچا کہ لوگوں نے اُس تماشا دیکھنے کی خاطر، جس کے اشتہار جہاز بانٹ رہے تھے دکانیں بند کر رکھی ہیں۔ اب اس نے خیال کیا۔ کہ وہ کوئی نہایت ہی دلچسپ تماشا ہوگا۔ جس کے لیئے تمام بازار بند ہیں۔ اس خیال نے خالد کو سخت بے چین کر دیا۔ اور وہ اُس وقت کا نہایت بیقراری سے انتظار کرنے لگا۔ جب اُس کا ابا اسے تماشا دکھلانے کو لے چلے۔

وقت گذرتا گیا ——— وہ خونی گھڑی قریب تر آتی گئی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ خالد، اس کا باپ اور والدہ صحن میں خاموش بیٹھے ایک دُوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے تک رہے تھے ——— ہوا سسکیاں بھرتی ہُوئی چل رہی تھی۔

تڑ۔ تڑ۔ تڑ۔ تڑ ....

یہ آواز سُنتے ہی خالد کے باپ کے چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا۔ زبان سے بمشکل اس قدر کہہ سکا "——— گولی ———"

خالد کی ماں فرطِ خوف سے ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکال سکی۔ گولی کا نام سُنتے ہی اسے ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے خُود اس کی چھاتی سے گولی اُتر رہی ہے۔

شام کے وقت تماشا دیکھنے تو ضرور چلیں گے نا؟"

کسی جواب کا انتظار کئے بغیر خالد کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور مختلف کمروں میں آوارہ پھرتا ہُوا اپنے والد کی نشست گاہ میں پہنچا۔ جس کی کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب بیٹھ کر وُہ بازار کی طرف جھانکنے لگا۔

کیا دیکھتا ہے کہ بازار میں دکانیں تو بند ہیں۔ مگر آمدورفت جاری ہے ــــ لوگ جلسے میں شریک ہونے کے لئے جا رہے تھے۔ وہ سخت حیران تھا۔ کہ دو تین روز سے دُکانیں کیوں بند رہتی ہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے اس نے اپنے ننھے دماغ پر بہتیرا زور دیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ کر سکا۔

بہت غور و فکر کے بعد اُس نے یہ سوچا کہ لوگوں نے اُس تماشا دیکھنے کی خاطر، جس کے اشتہار جہاز بانٹ رہے تھے دکانیں بند کر رکھی ہیں۔ اب اس نے خیال کیا۔ کہ وہ کوئی نہایت ہی دلچسپ تماشا ہوگا۔ جس کے لئے تمام بازار بند ہیں۔ اس خیال نے خالد کو سخت بے چین کر دیا۔ اور وہ اُس وقت کا نہایت بیقراری سے انتظار کرنے لگا۔ جب اُس کا ابّا اسے تماشا دکھلانے کو لے چلے۔

وقت گذرتا گیا ــــ وہ خونی گھڑی قریب تر آتی گئی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ خالد، اس کا باپ اور والدہ صحن میں خاموش بیٹھے ایک دُوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے تک رہے تھے ــــ ہوا سسکیاں بھرتی ہُوئی چل رہی تھی۔

تڑ۔ تڑ۔ تڑ۔ تڑ . . . .

یہ آواز سُنتے ہی خالد کے باپ کے چہرے کا رنگ کاغذ کی طرح سفید ہو گیا۔ زبان سے بمشکل اس قدر کہہ سکا "ــــ گولی ــــ"

خالد کی ماں فرطِ خوف سے ایک لفظ بھی مُنہ سے نہ نکال سکی۔ گولی کا نام سُنتے ہی اسے ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے خُود اس کی چھاتی سے گولی اُتر رہی ہے۔

خالد اس آواز کو سنتے ہی اپنے والد کی انگلی پکڑ کر کہنے لگا۔

"ابا جی چلو چلیں! تماشا تو شروع ہو گیا ہے"!

"کونسا تماشا"؟ خالد کے باپ نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"وہی تماشا، جس کے اشتہار آج صبح بانٹ رہے تھے ——کھیل شروع ہو گیا ہے، تبھی تو اتنے پٹاخوں کی آواز سنائی دے رہی ہے"۔

"ابھی بہت وقت باقی ہے، تم شور مت کرو —— خدا کے لئے اب جاؤ ماما کے پاس جا کر کھیلو"!

خالد یہ سنتے ہی باورچی خانے کی طرف گیا۔ مگر وہاں ماما کو نہ پا کر اپنے والد کی نشست گاہ میں چلا گیا۔ اور کھڑکی سے بازار کی طرف دیکھنے لگا۔

بازار آمدورفت بند ہو جانے کی وجہ سے سائیں سائیں کر رہا تھا —— دور فاصلے سے کتوں کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ چند لمحات کے بعد ان چیخوں میں انسان کی دردناک آواز بھی شامل ہو گئی۔

خالد کسی کو کراہتے سن کر بہت حیران ہوا۔ ابھی وہ اس آواز کی جستجو کے لئے کوشش کر رہا تھا، کہ چوک میں اسے ایک لڑکا دکھائی دیا۔ جو چیختا، چلاتا، بھاگتا چلا آ رہا تھا۔

خالد کے گھر کے عین مقابل وہ لڑکا لڑکھڑا کر گرا۔ اور گرتے ہی بیہوش ہو گیا —— اس کی پنڈلی پر ایک گہرا زخم تھا۔ جس سے فوارہ خون نکل رہا تھا۔

یہ سماں دیکھ کر خالد بہت خوفزدہ ہوا۔ بھاگ کر اپنے والد کے پاس آیا اور کہنے لگا: "ابا، ابا! بازار میں ایک لڑکا گر پڑا ہے —— اس کی ٹانگ سے بہت خون نکل رہا ہے"۔

یہ سنتے ہی خالد کا باپ کھڑکی کی طرف گیا۔ اور دیکھا کہ واقعی ایک نوجوان لڑکا بازار میں اوندھے منہ پڑا ہے۔

بادشاہ کے خوف سے اسے جرأت نہ ہوئی۔ کہ وہ اس لڑکے کو سڑک پر سے اٹھا کر

سامنے والی دکان کے پٹڑے پر لٹا دے ـــــ بے سازو برگ افراد کو اٹھانے کے لئے حکومت کے اربابِ حل و عقد نے آہنی گاڑیاں مہیا کر رکھی ہیں۔ مگر اس معصوم بچے کی نعش جو انہی کی تیغِ ستم کا شکار تھی۔ وہ ننھا پودا جو انہی کے ہاتھوں ملا گیا تھا۔ وہ کونپل جو کھلنے سے پہلے انہی کی عطا کردہ بادِ سموم سے جھلس گئی تھی۔ کسی کے دل کی راحت جو انہی کے جور و استبداد نے چھین لی تھی۔ اب اُنہی کی تیار کردہ سڑک پر ـــــ آہ! موت بھیانک ہے، مگر ظلم اس سے کہیں زیادہ خوفناک اور بھیانک ہے۔

"ابا اس لڑکے کو کسی نے پیٹا ہے"؟

خالد کا باپ اثبات میں سر ہلاتا ہُوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

جب خالد اکیلا کمرے میں رہ گیا۔ تو سوچنے لگا۔ کہ اس لڑکے کو اتنے بڑے زخم سے کتنی تکلیف ہُوئی ہو گی۔ جب کہ ایک دفعہ اُسے قلم تراش کی نوک چبھنے سے تمام رات نیند نہ آئی تھی۔ اور اُس کا باپ اور ماں تمام رات اُس کے سرہانے بیٹھے رہے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی اُسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ وہ زخم خُود اس کی پنڈلی میں ہے۔ اور اس میں شدت کا درد ہے ـــــ یک لخت وہ رونے لگ گیا۔

اس کے رونے کی آواز سُن کر اس کی والدہ دوڑی آئی۔ اور اُسے گود میں لے کر پوچھنے لگی۔

"میرے بچے رو کیوں رہے ہو"؟

"امی، اس لڑکے کو کسی نے مارا ہے"؟

شرارت کی ہو گی اُس نے"؟

خالد کی والدہ اپنے خاوند کی زبانی زخمی لڑکے کی داستان سُن چکی تھی۔

"مگر سکول میں تو شرارت کرنے پر چھڑی سے سزا دیتے ہیں۔ لہو تو نہیں نکالتے" خالد نے روتے ہُوئے اپنی والدہ سے کہا۔

"چھڑی زور سے لگ گئی ہو گی"!

"تو پھر کیا اس لڑکے کا والد سکول میں جا کر اس اُستاد پر خفا نہ ہو گا۔ جس نے اُس کے لڑکے کو اس قدر مارا ہے۔ ایک روز جب ماسٹر صاحب نے میرے کان کھینچ کر سُرخ کر دیئے تھے تو اباجی نے ہیڈ ماسٹر کے پاس جا کر شکایت کی تھی نا؟"

"اس لڑکے کا ماسٹر بہت بڑا آدمی ہے۔"

"اللہ میاں سے بھی بڑا۔؟"

"نہیں اُن سے چھوٹا ہے۔"

تو پھر وہ اللہ میاں کے پاس شکایت کرے گا۔"

خالد اب دیر ہو گئی ہے، چلو سوئیں۔"

"اللہ میاں! میں دُعا کرتا ہُوں۔ کہ تو اس ماسٹر کو جس نے اِس لڑکے کو پیٹا ہے۔ اچھی طرح سزا دے۔ اور اس چھڑی کو چھین لے جس کے استعمال سے خُون نکل آتا ہے —— میں نے پہاڑے یاد نہیں کیے۔ اس لیے مجھے ڈر ہے۔ کہ کہیں وہی چھڑی میرے استاد کے ہاتھ نہ آجائے —— اگر تم نے میری باتیں نہ مانیں، تو پھر میں بھی تُم سے نہ بولوں گا۔"

سوتے وقت خالد دل میں دُعا مانگ رہا تھا۔

(آتش پارے سے)

چوری

سکول کے تین چار لڑکے الاؤ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اور اُس بُوڑھے آدمی سے جوٹاٹ پر بیٹھا اپنے استخوانی ہاتھ تاپنے کی خاطر الاؤ کی طرف بڑھائے تھا کہنے لگے: "باباجی کوئی کہانی سنائیے"؟

مردِ معمر نے جو غالباً کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اپنا بھاری سر اٹھایا۔ جو گردن کی لاغری کی وجہ سے نیچے کو جھکا ہُوا تھا۔ "کہانی! ـــــ میں خود ایک کہانی ہُوں مگر ـــــ" اس کے بعد کے الفاظ اس نے اپنے پوپلے منہ ہی میں بڑبڑائے ـــــ شاید وہ اس جملے کو لڑکوں کے سامنے ادا کرنا نہیں چاہتا تھا جن کی سمجھ اس قابل نہ تھی۔ کہ وہ فلسفیانہ نکات حل کرسکے۔

لکڑی کے ٹکڑے ایک شور کے ساتھ جل جل کر آتشیں شکم کو پُر کر رہے تھے۔ شعلوں کی عنابی روشنی لڑکوں کے معصوم چہروں پر ایک عجیب انداز میں رقص کر رہی تھی۔ ننھی ننھی چنگاریاں سپید راکھ کی نقاب اُلٹ اُلٹ کر حیرت میں سربلند شعلوں کا مُنہ تک رہی تھیں۔

بُوڑھے آدمی نے الاؤ کی روشنی میں سے لڑکوں کی طرف نگاہیں اُٹھا کر کہا۔ کہانی ـــــ ہر روز کہانی! ـــــ کل سناؤں گا۔"

لڑکوں کے تمتماتے ہُوئے چہروں پر افسردگی چھا گئی۔ ناامیدی کے عالم میں وہ ایک

دُوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ گویا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے۔" آج رات کہانی سُنے بغیر سونا ہوگا۔" یکایک اُن میں سے ایک لڑکا جو دُوسروں کی بہ نسبت بہت ہشیار اور ذہین معلوم ہوتا تھا الاؤ کے قریب سرک کر بلند آواز میں بولا۔" مگر کل آپ نے وعدہ کیا تھا۔ اور وعدہ خلافی کرنا دُرست نہیں ہے ـــــ کیا آپ کو کل والے حامد کا انجام یاد نہیں ہے جو ہمیشہ اپنا کہا بھُول جایا کرتا تھا۔"

" درست ! ـــــ میں بھُول گیا تھا۔" بوڑھے آدمی نے یہ کہہ کر اپنا سر جُھکا لیا۔ جیسے وہ اپنی بھُول پر نادم ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اِس دلیر لڑکے کی جُرأت کا خیال کر کے مُسکرایا۔" میرے بچے ! مُجھ سے غلطی ہو گئی مجھے معاف کر دو ـــــ مگر میں کون سی کہانی سناؤں ؟ ـــــ ٹھہرو مجھے یاد کر لینے دو۔" یہ کہتے ہُوئے وہ سر جُھکا کر گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔

اسے جن اور پریوں کی لایعنی داستانوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ بچوں کو ایسی کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ جو اُن کے دل و دماغ کی اصلاح کر سکیں۔ اُسے بہت سے فضول قصے یاد تھے جو اس نے بچپن میں سُنے تھے۔ یا کتابوں میں پڑھے تھے۔ مگر اس وقت وہ اپنے بربطِ پیری کے بوسیدہ تار چھیڑ رہا تھا۔ کہ شاید ان میں کوئی خوابیدہ راگ جاگ اُٹھے۔

لڑکے باباجی کو خاموش دیکھ کر آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ غالباً اُس لڑکے کی بابت جسے کتاب چُرانے پر بید کی سزا ملی تھی۔ باتوں باتوں میں اُن میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔" ماسٹر جی کے لڑکے نے بھی تو میری کتاب چُرالی تھی۔ مگر اُسے سزا و زانہ ملی۔"

" کتاب چُرالی تھی۔" ان چار لفظوں نے جو بلند آواز میں ادا کئے گئے تھے۔ بوڑھے کی خفتہ یاد میں ایک واقعہ کو جگا دیا۔ اُس نے اپنا سپید سر اٹھایا۔ اور اپنی آنکھوں کے سامنے بھُولی بسری داستان کو انگڑائیاں لیتے پایا۔ ایک لمحہ کے لِئے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہُوئی۔ مگر وہیں غرق ہو گئی ـــــ اضطراب کی حالت میں اُس نے اپنے نحیف جسم کو جنبش دے کر الاؤ کے قریب کیا۔ اس کے چہرے کے تغیّر و تبدل سے صاف طور پر عیاں تھا۔ کہ وہ کسی واقعہ کو دوبارہ یاد کر کے

بہت تکلیف محسوس کر رہا ہے۔

الاؤ کی روشنی بدستور لڑکوں کے چہروں پر ناچ رہی تھی۔ دفعتاً بوڑھے نے آخری ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ "بچو! آج میں اپنی کہانی سُناؤں گا۔"

لڑکے فوراً اپنی باتیں چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ الاؤ کی چٹختی ہوئی لکڑیاں ایک شور کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر اُبھر کر خاموش ہو گئیں ——— ایک لمحہ کے لئے فضا پر مکمل سکوت طاری رہا ———

"باباجی اپنی کہانی سنائیں گے؟" ایک لڑکے نے خوش ہو کر کہا۔ باقی سرک کر آگ کے قریب خاموشی سے بیٹھ گئے۔

"ہاں، اپنی کہانی۔" یہ کہہ کر بوڑھے آدمی نے اپنی جھکی ہوئی گھنی بھوؤں میں سے کوٹھڑی کے باہر تاریکی میں دیکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکوں سے پھر مخاطب ہوا۔ "میں آج تمہیں اپنی پہلی چوری کی داستان سناؤں گا۔"

لڑکے حیرت سے ایک دُوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ اُنہیں اس بات کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ باباجی کسی زمانے میں چوری بھی کرتے رہے ہیں ——— باباجی جو ہر وقت انہیں بُرے کاموں سے بچنے کے لئے نصیحت کیا کرتے ہیں۔

لڑکا جو اُن سب میں دلیر تھا۔ اپنی حیرت نہ چھپا سکا۔ "پر کیا آپ نے واقعی چوری کی؟"

"واقعی!"

"آپ اُس وقت کس جماعت میں پڑھا کرتے تھے؟"

"نویں میں۔"

یہ سُن کر لڑکے کی حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ اُسے اپنے بھائی کا خیال آیا جو نویں جماعت میں تعلیم پا رہا تھا۔ وہ اِس سے عُمر میں دو گنا بڑا تھا۔ اُس کی تعلیم اس سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ انگریزی کی کتنی کتابیں پڑھ چکا تھا۔ اور اِسے ہر وقت نصیحتیں کیا کرتا تھا۔ یہ کیوں کر ممکن تھا۔ کہ اس عُمر کا

اور اچھا پڑھا لکھا لڑکا چوری کرے؟ ـــــ اُس کی عقل اِس معمہ کو حل نہ کر سکی۔ چنانچہ اس نے پھر سوال کیا: "آپ نے چوری کیوں کی؟"

اِس مشکل سوال نے بڈھے کو تھوڑی دیر کے لئے گھبرا دیا ـــــ آخر وہ اِس کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ کہ فلاں کام اس نے کیوں کیا؟ بظاہر اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا۔ اِس لئے اس وقت اس کے دماغ میں یہی خیال آیا"۔

اُس نے دل میں یہی جواب سوچا۔ مگر اس نے مطمئن نہ ہو کر یہ بہتر خیال کیا۔ کہ تمام داستان من عن بیان کر دے۔

اِس کا جواب میری کہانی ہے۔ جو میں اب تمہیں سنانے والا ہوں"۔

"سنائیے"۔

لڑکے اس بوڑھے آدمی کی چوری کا حال سُننے کے لئے اپنی اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئے۔ جوالاؤ کے سامنے اپنے سپید بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا۔ اور جسے وہ ایک بہت بڑا آدمی خیال کرتے تھے۔

بڈھا کچھ عرصے تک اپنے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتا رہا۔ پھر اُس بھولے ہوئے واقعہ کے تمام منتشر ٹکڑے فراہم کر کے بولا۔

ہر شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کرتا ہے جس پر وہ تمام عمر نادم رہتا ہے۔ میری زندگی میں سب سے بُرا فعل ایک کتاب کی چوری ہے ـــ"

یہ کہہ کر وہ رُک گیا۔ اُس کی آنکھیں جو ہمیشہ چمکتی رہتی تھیں۔ دھندلی پڑ گئیں۔ اس کے چہرے کی تبدیلی سے صاف ظاہر تھا۔ کہ وہ اِس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے زبردست ذہنی تکلیف کا سامنا کر رہا ہے۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔

"سب سے مکروہ فعل کتاب کی چوری ہے۔ یہ میں نے ایک کُتب فروش کی دکان سے چرائی یہ اس زمانے کا ذکر ہے۔ جب میں نویں جماعت میں تعلیم پاتا تھا۔ قدرتی طور پر جیسا کہ اب

تمہیں کہانی سُننے کا شوق ہے۔ مُجھے افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق تھا۔۔۔۔۔۔۔ دوستوں سے مانگ کر یا خُود خرید کر میں ہر ہفتے ایک نہ ایک کتاب ضرور پڑھا کرتا تھا۔ وہ کتابیں عموماً عشق و محبت کی بے معنی داستانیں یا فضُول جاسوسی قصّے ہُوا کرتے تھے۔ یہ کتابیں میں ہمیشہ چُھپ چُھپ کر پڑھا کرتا تھا۔ والدین کو اس بات کا علم نہ تھا۔ اگر اُنہیں معلوم ہوتا تو وہ مُجھے ایسا ہرگز ہرگز نہ کرنے دیتے۔ اس لیے کہ اس قسم کی کتابیں اسکول کے لڑکے کے لیے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ میں ان کے مہلک نُقصان سے غافل نہ تھا۔ چنانچہ مُجھے اِس کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔۔۔ میں نے چوری کی اور پکڑا گیا۔۔۔۔۔۔“

ایک لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر کہا: ”آپ پکڑے گئے؟“

”ہاں پکڑا گیا۔۔۔۔۔ چونکہ میرے والدین اس واقعہ سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ عادت پکتے پکتے میری طبیعت بن گئی۔ گھر سے جتنے پیسے مِلتے میں اُنہیں جوڑ جوڑ کر بازار سے افسانوں کی کتابیں خریدنے میں صرف کر دیتا۔ اسکول کی پڑھائی سے رفتہ رفتہ مُجھے نفرت ہونے لگی۔ ہر وقت میرے دل میں یہی خیال سمایا رہتا کہ فلاں کتاب جو فلاں ناول نویس نے لکھی ہے۔ ضرور پڑھنی چاہیئے۔ یا فلاں کتب فروش کے پاس نئی ناولوں کا جو ذخیرہ موجُود ہے۔ ایک نظر ضرور دیکھنا چاہیئے۔ شوق کی یہ انتہا دُوسرے معنوں میں دیوانگی ہے۔ اس حالت میں اِنسان کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ یا کیا کر رہا ہے۔ اُس وقت وہ بے عقل بچے کی مانند ہوتا ہے جو اپنی طبیعت خُوش کرنے یا شوق پُورا کرنے کے لیے جلتی ہُوئی آگ میں بھی ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ اسے پتہ نہیں ہوتا کہ چمکنے والی شے جسے وہ پکڑ رہا ہے اس کا ہاتھ جلا دے گی۔ ٹھیک یہی حالت میری تھی۔ فرق اتنا ہے کہ بچہ شعُور سے محروم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بغیر سمجھے بُوجھے بُری سے بُری حرکت کر بیٹھتا ہے۔ مگر میں نے عقل کا مالک ہوتے ہُوئے چوری ایسے مکروہ جُرم کا اِرتکاب کیا۔۔۔۔ یہ آنکھوں کی موجُودگی میں میرے اندھے ہونے کی دلیل ہے۔ میں ہرگز ایسا کام نہ کرتا۔۔۔ اگر میری عادت مُجھے مجبُور نہ کرتی۔

ہر انسان کے دماغ میں شیطان موجود ہوتا ہے۔ جو وقتاً فوقتاً اُسے بُرے کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ یہ شیطان مجھ پر اُس وقت غالب آیا جب کہ سوچنے کے لئے میرے پاس بہت کم وقت تھا ——— خیر"

لڑکے خاموشی سے بوڑھے کے ملتے ہوئے لبوں کی طرف نگاہیں گاڑھے اُس کی داستان سُن رہے تھے۔ داستان کا تسلسل اس وقت ٹوٹتا دیکھ کر جب کہ اصل مقصد بیان کیا جانے والا تھا۔ وہ بڑی بے قراری سے بقایا تفصیل کا انتظار کرنے لگے۔

"مسعود بیٹا! یہ سامنے والا دروازہ تو بند کر دینا ——— سرد ہوا آرہی ہے" بوڑھے نے اپنا کمبل گھٹنوں پر ڈال لیا۔

مسعود "اچھا باباجی" کہہ کر اُٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرنے کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"ہاں تو ایک دن جب کہ والد گھر سے باہر تھے" بوڑھے نے اپنی داستان کا بقایا حصہ شروع کیا۔ "مجھے بھی کوئی خاص کام نہ تھا۔ اور وہ کتاب جو میں اِن دنوں پڑھ رہا تھا ختم ہونے کے قریب تھی۔ اس لئے میرے جی میں آئی کہ چلو اُس کُتب فروش تک ہو آئیں۔ جس کے پاس بہت سی جاسوسی ناولیں پڑی تھیں۔

میری جیب میں اِس وقت اتنے پیسے موجود تھے۔ جو ایک معمولی ناول کے دام ادا کرنے کے لئے کافی ہوں، چنانچہ میں گھر سے سیدھا اُس کتب فروش کی دُکان پر گیا ——— یوں تو اُس دکان پر ہر وقت بہت سی اچھی اچھی ناولیں موجود رہتی تھیں۔ مگر اُس دن خاص طور پر بالکل نئی کتابوں کا ایک ڈھیر باہر تختے پر رکھا تھا۔ ان کتابوں کے رنگ برنگ سرورق دیکھ کر میری طبیعت میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا۔ دل میں اِس خواہش نے گدگدی لی۔ کہ وہ تمام میری ہو جائیں۔

میں دکاندار سے اجازت لے کر ان کتابوں کو ایک نظر دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ ہر کتاب کے شوخ رنگ سرورق پر اِس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت لکھی ہوئی تھی۔

"ناممکن ہے کہ اس کا مطالعہ آپ پہ سنسنی طاری نہ کر دے۔"

"مصورِ اسرار کا لاثانی شاہکار۔"

"تمثیل! ہیجان!! رُومان!!! ——— سب یکجا۔"

اِس قسم کی عبارتیں شوق بڑھانے کے لِئے کافی تھیں۔ مگر میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اِس لِئے کہ میری نظروں سے اکثر ایسے الفاظ گذر چکے تھے۔ میں تھوڑا عرصہ کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اُس وقت میرے دل میں چوری کرنے کا خیال مطلقاً نہ تھا۔ بلکہ میں نے خریدنے کے لِئے ایک کم قیمت کی ناول چُن کر الگ بھی رکھ لی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد دل میں یہ ارادہ کر کے میں دُوسرے ہفتے ان ناولوں کو دوبارہ دیکھنے آؤں گا ——— میں نے اپنی چُنی ہُوئی کتاب اُٹھائی ——— کتاب کا اٹھانا تھا کہ میری نگاہیں ایک مجلد ناول پر گڑ گئیں۔ سرورق کے کونے پر میرے محبُوب ناولسٹ کا نام سُرخ لفظوں میں چھپا تھا۔ اُس کے ذرا اُوپر کتاب کا نام تھا۔

منتقم شعاعیں ——— کس طرح ایک دیوانے ڈاکٹر نے لندن کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا۔"

منتقم شعاعیں ——— دیوانے ڈاکٹر کی ایجاد ——— کیسا دلچسپ افسانہ ہو گا!

"لندن تباہ کرنے کا ارادہ ——— یہ کس طرح ہو سکتا ہے"؟

"اِس مصنف نے فلاں فلاں کتابیں کتنی سنسنی خیز لکھی ہیں!

یہ کتاب ضرور اُن سب سے بہتر ہو گی"!

میں خاموش اشتیاق کے ساتھ اُس کتاب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور یہ خیالات یکے بعد دیگرے میرے کانوں میں شور برپا کر رہے تھے۔ میں نے اُس کتاب کو اٹھایا اور کھول کر دیکھا تو پہلے ورق پر یہ عبارت نظر آئی۔ "مصنف اس کتاب کو اپنی بہترین تصنیف قرار دیتا ہے۔"

"اِن الفاظ نے میرے اشتیاق میں آگ پر ایندھن کا کام دیا۔ ایکا ایکی میرے دماغ

کے خُدا معلوم کس گوشے سے ایک خیال کود پڑا —— وہ یہ کہ میں اس کتاب کو اپنے کوٹ میں چھپا کرلے جاؤں۔ میری آنکھیں بے اختیار کتب فروش کی طرف مُڑیں۔ جو کاغذ پر کچھ لکھنے میں مشغول تھا۔ دوکان کی دُوسری طرف دو نوجوان کھڑے میری طرح کتابیں دیکھ رہے تھے —— میں سر سے پیر تک لرز گیا۔"

یہ کہتے ہُوئے بُوڑھے کا نحیف جسم اس واقعہ کی یاد سے کانپا —— تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر اُس نے پھر اپنی داستان شرُوع کر دی۔ ایک لحظہ کے لیئے میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہُوا کہ چوری کرنا بہت بُرا کام ہے۔ مگر ضمیر کی آواز سرورق پر بنی ہُوئی لانبی لانبی شعاعوں میں غرق ہو گئی۔ میرا دماغ "منتقم شعاعیں" "منتقم شعاعیں" کی گردان کر رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر جھانکا اور جھٹ سے وہ کتاب کوٹ کے اندر بغل میں دبالی مگر میں کانپنے لگا۔

اِس حالت پر قابُو پا کر میں کتب فروش کے قریب گیا۔ اور اُس کتاب کے دام ادا کر دیئے جو میں نے پہلے خریدی تھی۔ قیمت لیتے وقت اور رُوپے میں سے باقی پیسے واپس کرنے میں اُس نے غیر معمولی تاخیر سے کام لیا۔ میری طرف اُس نے گھور کر بھی دیکھا۔ جس سے میری طبیعت سخت پریشان ہو گئی۔ جی میں بھی آئی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ نکلوں۔

میں نے اِس دوران میں کئی بار اُس جگہ پر جو کتاب کی وجہ سے اُبھری ہُوئی تھی نگاہ ڈالی —— اور شاید اُسے چھپانے کی بے سُود کوشش بھی کی۔ میری ان عجیب و غریب حرکتوں کو دیکھ کر اُسے شک ضرور ہُوا۔ اِس لئے کہ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کر کے پھر خاموش ہو جاتا تھا۔

میں نے باقی پیسے جلدی سے لِئے اور وہاں سے چل دیا۔ دو سو قدم کے فاصلے پر میں نے کِسی کی آواز سُنی مڑ کر دیکھا تو کتب فروش ننگے پاؤں چلا آ رہا تھا۔ اور مُجھے ٹھہرنے کے لئے کہہ رہا تھا —— میں نے اندھا دُھند بھاگنا شروع کر دیا۔

مُجھے معلُوم نہ تھا کہ میں کدھر بھاگ رہا ہُوں۔ میرا رُخ اپنے گھر کی جانب نہ تھا۔ میں شروع ہی سے اُس طرف بھاگ رہا تھا جدھر بازار کا اختتام تھا۔ اِس غلطی کا مُجھے اس وقت احساس

ہُوا جب دو تین آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔"

بوڑھا اِتنا کہہ کر اضطراب کی حالت میں اپنی خُشک زبان لبوں پر پھیرنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد وہ ایک لڑکے سے مخاطب ہوا۔

"مسعود! پانی کا ایک گھونٹ پلوانا۔"

مسعود خاموشی سے اُٹھا اور کوٹھڑی کے ایک کونے میں پڑے ہُوئے گھڑے سے گلاس میں انڈیل کر لے آیا۔ بُوڑھے نے گلاس لیتے ہی مُنہ سے لگا لیا۔ اور ایک گھونٹ میں سارا پانی پی گیا۔ اور خالی گلاس زمین پر رکھتے ہُوئے کہا۔

ہاں میں کیا بیان کر رہا تھا؟"

ایک لڑکے نے جواب دیا۔" آپ بھاگے جا رہے تھے۔"

میرے پیچھے کتب فروش "چور چور" کی آواز بلند کرتا چلا آ رہا تھا۔ جب میں نے دو تین آدمیوں کو اپنا تعاقب کرتے دیکھا تو میرے ہوش ٹھکانے نہ رہے۔ جیل کی آہنی سلاخیں، پولیس اور عدالت کی تصویریں ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے آ گئیں۔ بے عزتی کے خیال سے میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ میں لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ اُٹھنا چاہا تو ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ اس وقت میرے دماغ کی عجیب حالت تھی۔ ایک تند دھواں سا میرے سینے میں کروٹیں لے رہا تھا۔ آنکھیں فرطِ خوف سے اُبل رہی تھیں۔ اور کانوں میں ایک زبردست شور برپا تھا۔ جیسے بہت سے لوگ آہنی چادریں ہتھوڑوں سے کوٹ رہے ہیں۔ میں ابھی اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ کتب فروش اور اُس کے ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ اس وقت میری کیا حالت تھی۔ اس کا بیان کرنا بہت دشوار ہے ——— سینکڑوں خیالات پتھروں کی طرح میرے دماغ سے ٹکرا ٹکرا کر مختلف آوازیں پیدا کر رہے تھے۔ جب اُنھوں نے مجھے پکڑا تو ایسا معلوم ہُوا کہ آہنی پنجہ نے میرے دل کو مسل ڈالا ہے ——— میں بالکل خاموش تھا۔ وہ مجھے دکان کی طرف کشاں کشاں لے گئے۔

جیل خانہ کی کوٹھڑی اور عدالت کا مُنہ دیکھنا یقینی تھا۔ اس خیال پر میرے ضمیر نے لعنت ملامت شروع کر دی۔ چونکہ اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اور میرے پاس اپنے ضمیر کو جواب دینے کے لئے کوئی الفاظ موجود نہ تھے۔ اِس لئے میری گرم آنکھوں میں آنسو اُتر آئے اور میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔"

یہ کہتے ہوئے بوڑھے کی دُھندلی آنکھیں غم ناک ہو گئیں۔

"کتب فروش نے مجھے پُولیس کے حوالے نہ کیا۔ اپنی کتاب لے لی اور نصیحت کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔" بوڑھے نے اپنے آنسو کھُردرے کمبل سے خشک کئے ——— "خُدا اس کو جزائے خیر دے۔ میں عدالت کے دروازے سے تو بچ گیا۔ مگر اس واقعہ کی والد اور سکُول کے لڑکوں کو خبر ہو گئی۔ والد مجھ پر سخت خفا ہوئے لیکن انھوں نے بھی آخیر میں مجھے معاف کر دیا۔"

دو تین روز مجھے اس ندامت کے باعث بخار آتا رہا۔ اس کے بعد جب میں نے دیکھا میرا دل کسی کروٹ آرام نہیں لیتا اور مجھ میں اتنی قوت نہیں کہ میں لوگوں کے سامنے اپنی نگاہیں اُٹھا سکوں۔ تو میں شہر چھوڑ کر وہاں سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک میں نے مختلف شہروں کی خاک چھانی ہے۔ ہزاروں مصائب برداشت کئے ہیں۔ صرف اُس کتاب کی چوری کی وجہ سے جو مجھے تادم مرگ نادم و شرمسار رکھے گی۔

"اِس آوارہ گردی کے دوران میں مَیں نے اور بھی بہت سی چوریاں کیں۔ ٹل کے ٹالے اور ہمیشہ پکڑا گیا۔ مگر ان پر نادم نہیں ہُوں ——— مجھے فخر ہے۔"

بُوڑھے کی دُھندلی آنکھوں میں پھر پہلی سی چمک نمودار ہو گئی۔ اور اُس نے الاؤ کے شعلوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ "ہاں مجھے فخر ہے۔" یہ الفاظ اس نے تھوڑے توقف کے دوبارہ کہے۔

الاؤ میں آگ کا ایک شعلہ بُلند ہُوا ——— اور ایک لمحہ فضا میں تھرتھرا کر وہیں سو گیا۔

بوڑھے نے شعلے کی جرأت دیکھی اور مُسکرا دیا۔ پھر لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "کہانی ختم ہو گئی ہے اب تُم جاؤ۔ تمہارے ماں باپ انتظار کرتے ہوں گے۔"

مسعود نے سوال کیا۔ "مگر آپ کو اپنی دُوسری چوریوں پر کیوں فخر ہے؟"

"فخر کیوں ہے"؟ ——— "بوڑھا مُسکرا دیا۔" اس لیئے کہ وہ چوریاں نہیں تھیں ——— اپنی مسروقہ چیزوں کو دوبارہ حاصل کرنا چوری نہیں ہوتی میرے عزیز! بڑے ہو کر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ہر وہ چیز جو تم سے چُرالی گئی ہے، تمہیں حق حاصل ہے کہ اُسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قبضہ میں لے آؤ۔ پر یاد رہے تمہاری کوشش کامیاب ہونی چاہیئے۔ ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اٹھانا عبث ہے۔"

لڑکے اُٹھے اور بابا جی کو شب بخیر کہتے ہوئے کوٹھڑی کے دروازے سے باہر چلے گئے۔ بوڑھے کی نگاہیں ان کو تاریکی میں گم ہوتے دیکھتی رہیں۔ تھوڑی دیر اسی طرح دیکھنے کے بعد وہ اُٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

"کاش کہ یہ بڑے ہو کر اپنی کھوئی چیزیں واپس لے سکیں۔" بوڑھے کو خُدا معلوم ان لڑکوں سے کیا اُمید تھی؟

("آتش پارے" سے)

”منٹو زمین کے بہت قریب ہے، اس قدر قریب کہ اکثر
گھاس کے خوشے میں رینگنے والے کیڑے بھی اپنے تمام اوصاف
کے ساتھ اُسے نظر آتے ہیں۔“

کرشن چندر (گلِ خنداں' منٹو نمبر)

ساڑھے تین آنے

"میں نے قتل کیوں کیا۔ ایک اِنسان کے اپنے خُون میں اپنے ہاتھ کیوں رنگے، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ جب تک میں اس کے تمام عواقب و عواطف سے آپ کو آگاہ نہیں کروں گا، آپ کو کچھ پتہ نہیں چلے گا ——— مگر اس وقت آپ لوگوں کی گفتگو کا موضوع جُرم اور سزا ہے۔ اِنسان اور جیل ہے ——— چُونکہ میں جیل رہ چکا ہُوں، اس لئے میری رائے نا دُرست نہیں ہو سکتی۔ مُجھے منٹو صاحب سے پُورا اتفاق ہے کہ جیل، مُجرم کی اصلاح نہیں کر سکتی۔ مگر یہ حقیقت اتنی بار دہرائی جا چکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہُوا لطیفہ بیان کر رہا ہے ——— اور یہ لطیفہ نہیں کہ اس حقیقت کو جانتے پہچانتے ہُوئے بھی ہزارہا جیل خانے موجُود ہیں۔ ہتھکڑیاں ہیں اور وہ تنگِ انسانیت بیڑیاں ——— میں قانُون کا یہ زیور پہن چُکا ہُوں۔"

یہ کہہ کر رضوی نے میری طرف دیکھا اور مُسکرایا۔ اُس کے موٹے موٹے حبشیوں کے سے ہونٹ عجیب انداز میں پھڑکے۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی مخمُور آنکھیں، جو قاتل کی آنکھیں لگتی تھیں چمکیں۔ ہم سب چونک پڑے تھے۔ جب اس نے یکایک ہماری گفتگو میں حصہ لینا شرُوع کر دیا تھا۔ وہ ہمارے قریب کُرسی پر بیٹھا کریم ملی ہُوئی کوفی پی رہا تھا۔ جب اُس نے خُود کو متعارف کیا تو

ہمیں وہ تمام واقعات یاد آگئے جو اس کی قتل کی واردات سے وابستہ تھے۔ وعدہ معاف گواہ بن کر اُس نے بڑی صفائی سے اپنی اور اپنے دوستوں کی گردن پھانسی کے پھندے سے بچالی تھی۔

وہ اُسی دن رہا ہو کر آیا تھا۔ بڑے شائستہ انداز میں وہ مجھ سے مخاطب ہُوا۔ معاف کیجئے گا منٹو صاحب —— آپ لوگوں کی گفتگو سے مجھے دلچسپی ہے۔ میں ادیب تو نہیں، لیکن آپ کی گفتگو کا جو موضوع ہے اُس پر اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ نہ کچھ ضرور کہہ سکتا ہوں۔ پھر اس نے کہا۔ "میرا نام صدیق رضوی ہے —— لنڈا بازار میں جو قتل ہُوا تھا، میں اُس سے متعلق تھا۔"

میں نے اس قتل کے متعلق صرف سرسری طور پر پڑھا تھا۔ لیکن جب رضوی نے اپنا تعارف کرایا تو میرے ذہن میں خبروں کی تمام سُرخیاں اُبھر آئیں۔

ہماری گفتگو کا موضوع یہ تھا کہ آیا جیل مجرم کی اصلاح کر سکتی ہے۔ میں خُود محسوس کر رہا تھا۔ ہم ایک باسی روٹی کھا رہے ہیں۔ رضوی نے جب یہ کہا "یہ حقیقت اتنی بار دُہرائی جا چُکی ہے کہ اس پر زور دینے سے آدمی کو یُوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ کسی محفل میں ہزار بار سنایا ہُوا لطیفہ بیان کر رہا ہے۔" تو مجھے بڑی تسکین ہُوئی۔ میں نے یہ سمجھا جیسے رضوی نے میرے خیالات کی ترجمانی کر دی ہے۔

کریم ملی ہُوئی کوفی کی پیالی ختم کر کے رضوی نے اپنی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔ منٹو صاحب آدمی جُرم کیوں کرتا ہے —— جُرم کیا ہے، سزا کیا ہے —— میں نے اس کے متعلق بہت غور کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر جُرم کے پیچھے ایک ہسٹری ہوتی ہے —— زندگی کے واقعات کا ایک بہت بڑا ٹکڑا ہوتا ہے بہت اُلجھا ہُوا ٹیڑھا میڑھا —— میں نفسیات کا ماہر نہیں —— لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ انسان سے خُود جرم سرزد نہیں ہوتا۔ حالات سے ہوتا ہے!!

نصیر نے کہا: "آپ نے بالکل درست کہا ہے۔"

رضوی نے ایک اور کافی کا آرڈر دیا اور نصیر سے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں جناب لیکن میں

نے جو کچھ عرض کیا ہے اپنے مشاہدات کی بنا پر عرض کیا ہے، ورنہ یہ موضوع بہت پرانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وکٹر ہیوگو ـــــ فرانس کا ایک مشہور ناولسٹ شاید کسی اور ملک کا ہو ـــــ آپ تو خیر جانتے ہی ہوں گے، جرم اور سزا پر اُس نے کافی لکھا ہے ـــــ مجھے اُس کی تصنیف کے چند فقرے یاد ہیں۔" یہ کہہ کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔"منٹو صاحب، غالباً آپ ہی کا ترجمہ تھا؟ ـــــ وہ سیڑھی اُتار دو جو انسان کو جرائم اور مصائب کی طرف لے جاتی ہے ـــــ لیکن میں سوچتا ہوں کہ وہ سیڑھی کون سی ہے۔ اُس کے کتنے زینے ہیں؟

کچھ بھی ہو، یہ سیڑھی ضرور ہے، اس کے زینے بھی ہیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، بے شمار ہیں، ان کو گننا، ان کا شمار کرنا ہی سب سے بڑی بات ہے ـــــ منٹو صاحب، حکومتیں رائے شماری کرتی ہیں، حکومتیں اعداد شماری کرتی ہیں، حکومتیں ہر قسم کی شماری کرتی ہیں ـــــ اس سیڑھی کے زینوں کی شماری کیوں نہیں کرتیں ـــــ کیا یہ اُن کا فرض نہیں

میں نے قتل کیا ـــــ لیکن اس سیڑھی کے کتنے زینے طے کر کے کیا ـــــ حکومت نے مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیا، اس لیے کہ قتل کا ثبوت اُس کے پاس نہیں تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ میں اپنے گناہ کی معافی کس سے مانگوں ـــــ وہ حالات جنہوں نے مجھے قتل کرنے پر مجبور کیا تھا اب میرے نزدیک نہیں ہیں، اُن میں اور مجھ میں ایک برس کا فاصلہ ہے۔ میں اس فاصلے سے معافی مانگوں یا ان حالات سے جو بہت دُور کھڑے میرا مُنہ چڑا رہے ہیں۔"

ہم سب رضوی کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ وہ بظاہر تعلیم یافتہ معلوم نہیں ہوتا تھا، لیکن اُس کی گفتگو سے ثابت ہوا کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور بات کرنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ میں نے اُس سے کچھ کہا ہوتا، لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سُنتا جاؤں۔ اسی لیے میں اس کی گفتگو میں حائل نہ ہوا۔

اس کے لیے نئی کوفی آ گئی تھی۔ اُسے بنا کر اُس نے چند گھونٹ پیئے اور کہنا شروع کیا۔" خدا معلوم میں کیا بکواس کرتا رہا ہوں، لیکن میرے ذہن میں ہر وقت ایک آدمی کا

خیال رہا ہے ــــ اس آدمی کا، اس بھنگی کا جو ہمارے ساتھ جیل میں تھا۔ اُس کو ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر ایک برس کی سزا ہُوئی تھی۔"

نصیر نے حیرت سے پُوچھا۔ صرف ساڑھے تین آنے چوری کرنے پر؟"

رضوی نے تلخ آلود جواب دیا۔ "جی ہاں ــــ صرف ساڑھے تین آنے کی چوری پر اور جو اس کو نصیب نہ ہُوئے، کیونکہ وہ پکڑا گیا ــــ یہ رقم خزانے میں محفُوظ ہے اور پھگو بھنگی غیر محفوظ ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے وہ پھر پکڑا جائے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے اس کا پیٹ پھر اُسے مجبُور کرے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اُن سے گُو مُوت صاف کرانے والے اُس کی تنخواہ نہ دے سکیں، کیونکہ ہو سکتا ہے اُس کو تنخواہ دینے والوں کو اپنی تنخواہ نہ ملے ــــ یہ ہو سکتا ہے کا یہ سِلسلہ منٹو صاحب عجیب و غریب ہے۔ سچ پوچھئے تو دُنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ رضوی سے قتل بھی ہو سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تھوڑے عرصے کے لِئے خاموش ہو گیا۔ نصیر نے اُس سے کہا۔ "آپ پھگو بھنگی کی بات کر رہے تھے؟"

رضوی نے اپنی چھدری مونچھوں پر سے کوفی رومال کے ساتھ پونچھی۔ "جی ہاں ــــ پھگو بھنگی چور ہونے کے باوجُود، یعنی وہ قانُون کی نظروں میں چور تھا۔ لیکن ہماری نظروں میں پُورا ایماندار ــــ خُدا کی قسم میں نے آج تک اس جیسا ایماندار آدمی نہیں دیکھا، ساڑھے تین آنے اُس نے ضرور چُرائے تھے، اس نے صاف صاف عدالت میں کہہ دیا تھا کہ یہ چوری میں نے ضرور کی ہے، میں اپنے حق میں کوئی گواہی پیش نہیں کرنا چاہتا ــــ میں دو دن کا بُھوکا تھا، مجبُوراً مُجھے کریم درزی کی جیب میں ہاتھ ڈالنا پڑا۔ اُس سے مُجھے پانچ روپے لینے تھے ــــ دو مہینوں کی تنخواہ ــــ حضُور اُس کا بھی کُچھ قصُور نہیں تھا۔ اس لِئے کہ اس کے کئی گاہکوں نے اس کی سلائی کے پیسے مارے ہُوتے تھے ــــ حضُور، میں پہلے بھی چوریاں کر چُکا ہُوں۔ ایک دفعہ میں نے دس رُوپے ایک میم صاحب کے بٹوے سے

نکال لیے تھے۔ مجھے ایک مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ پھر میں نے ڈپٹی صاحب کے گھر سے چاندی کا ایک کھلونا چرایا تھا۔ اس لیے کہ میرے بچے کو نمونیا تھا اور ڈاکٹر بہت فیس مانگتا تھا —— حضور میں آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ میں چور نہیں ہوں —— کچھ حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے چوریاں کرنی پڑیں —— اور حالات ہی ایسے تھے کہ میں پکڑا گیا —— مجھ سے بڑے بڑے چور موجود ہیں لیکن وہ ابھی تک پکڑے نہیں گئے —— حضور، اب میرا بچہ بھی نہیں ہے بیوی بھی نہیں ہے —— لیکن حضور افسوس ہے کہ میرا پیٹ ہے، یہ مر جائے تو سارا جھنجھٹ ہی ختم ہو جائے۔ حضور مجھے معاف کر دو —— لیکن حضور نے اس کو معاف نہ کیا اور عادی چور سمجھ کر اس کو ایک برس قید با مشقت کی سزا دے دی؟"

رضوی بڑے بے تکلف انداز میں بول رہا تھا۔ اس میں کوئی تصنع، کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ الفاظ خود بخود اس کی زبان پر آتے اور بہتے چلے جا رہے ہیں۔ میں بالکل خاموش تھا۔ سگرٹ پی رہا تھا اور اسکی باتیں سُن رہا تھا۔ نصیر پھر اس سے مخاطب ہُوا۔ "آپ بھگو کی ایمانداری کی بات کر رہے تھے؟"

"جی ہاں" رضوی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی۔ "میں نہیں جانتا قانون کی نگاہوں میں ایمانداری کیا چیز ہے، لیکن میں اتنا جانتا ہُوں کہ میں نے بڑی ایمانداری سے قتل کیا تھا —— اور میرا خیال ہے کہ بھگو بھنگی نے بڑی ایمانداری سے ساڑھے تین آنے چُرائے تھے —— میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ ایمانداری کو صِرف اچھی باتوں سے کیوں منسُوب کرتے ہیں، اور سچ پُوچھئے تو میں اب یہ سوچنے لگا ہوں کہ اچھائی اور بُرائی ہے کیا۔ ایک چیز آپ کے لیے اچھی ہو سکتی ہے، میرے لیے بُری۔ ایک سوسائٹی میں ایک چیز اچھی سمجھی جاتی ہے، دُوسری میں بُری —— ہمارے مسلمانوں میں بغلوں کے بال بڑھانا گناہ سمجھا جاتا ہے، لیکن سکھ اس سے بے نیاز ہیں۔ اگر یہ بال بڑھانا واقعی گناہ ہے تو خُدا ان کو سزا کیوں نہیں دیتا۔ اگر کوئی خُدا ہے تو میری اس سے درخواست ہے کہ خدا کے لیے تم یہ انسانوں کے

قوانین توڑ دو، ان کی بنائی ہوئی جیلیں ڈھا دو ـــــ اور آسمان پر اپنی جیلیں خود بناؤ۔ خود اپنی عدالت میں ان کو سزا دو، کیونکہ اور کچھ نہیں تو کم از کم خدا تو ہو۔"

رضوی کی اس تقریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کی خام کاری ہی اصل میں تاثر کا باعث تھی۔ وہ باتیں کرتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے وہ ہم سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے دل ہی دل میں گفتگو کر رہا ہے۔

اُس کی بیڑی بجھ گئی تھی، غالباً اس میں تمباکو کی گانٹھ اٹکی ہوئی تھی، اس لیے کہ اُس نے پانچ چھ مرتبہ اس کو سلگانے کی کوشش کی۔ جب نہ سلگی تو پھینک دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "منٹو صاحب، بھگو مجھے اپنی تمام زندگی یاد رہے گا۔ ـــــ آپ کو بتاؤں گا تو آپ ضرور کہیں گے کہ جذباتیت ہے۔ لیکن خدا کی قسم جذباتیت کو اُس میں کوئی دخل نہیں ـــــ وہ میرا دوست نہیں تھا ـــــ نہیں وہ میرا دوست تھا کیونکہ اس نے ہر بار خود کو ایسا ہی ثابت کیا۔"

رضوی نے جیب میں سے دُوسری بیڑی نکالی مگر وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے سگریٹ پیش کیا تو اس نے قبول کر لیا۔ "شکریہ ـــــ منٹو صاحب، معاف کیجیے گا، میں نے اتنی بکواس کی ہے حالانکہ مجھے نہیں کرنی چاہیئے تھی، اس لیے کہ ماشا اللہ آپ ـــــ"

میں نے اس کی بات کاٹی۔ "رضوی صاحب، میں اس وقت منٹو نہیں ہوں صرف سعادت حسن ہوں۔ آپ اپنی گفتگو جاری رکھئے۔ میں بڑی دلچسپی سے سُن رہا ہوں۔"

رضوی مسکرایا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی مخمور آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ "آپ کی بڑی نوازش ہے۔" پھر وہ نصیر سے مخاطب ہُوا۔ "میں کیا کہہ رہا تھا۔"

میں نے اس سے کہا۔ "آپ بھگو کی ایمانداری کے متعلق کچھ کہنا چاہتے تھے۔"

"جی ہاں" یہ کہہ کر اس نے میرا پیش کیا ہُوا سگریٹ سلگایا۔ "منٹو صاحب، قانون کی نظروں میں وہ عادی چور تھا۔ بیڑیوں کے لیے ایک دفعہ اس نے آٹھ آنے چرائے تھے۔ بڑی

مشکلوں سے، دیوار پھاند کر جب اُس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی تو اُس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ قریب قریب ایک برس تک وہ اس کا علاج کراتا رہا تھا۔ مگر جب میرا ہم الزام دوست جرجی بیس بیڑیاں اس کی معرفت بھیجتا تو وہ سب کی سب پُولیس کی نظریں بچا کر میرے حوالے کر دیتا۔ وعدہ معاف گواہوں پر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے۔ لیکن جرجی نے بھگو کو اپنا دوست اور ہمراز بنا لیا تھا۔ وہ بھنگی تھا، لیکن اُس کی فطرت بہت خوشبودار تھی شروع شروع میں جب وہ جرجی کی بیڑیاں لے کر میرے پاس آیا تو میں نے سوچا، اس حرامزادے چور نے ضرور ان میں سے کچھ غائب کر لی ہوں گی، مگر بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ وہ قطعی طور پر ایماندار تھا —— بیڑی کے لیے اُس نے آٹھ آنے چُراتے ہوئے اپنے ٹخنے کی ہڈی تڑوالی تھی مگر یہاں جیل میں جہاں اُس کو تمباکو کہیں سے بھی نہیں مل سکتا تھا، وہ جرجی کی دی ہُوئی بیڑیاں تمام و کمال میرے حوالے کر دیتا تھا، جیسے وہ امانت ہوں —— پھر وہ کچھ دیر ہچکچانے کے بعد مجھ سے کہتا، بابو جی ایک بیڑی تو دیجئے اور میں اس کو صرف ایک بیڑی دیتا انسان بھی کتنا کمینہ ہے!"

رضوی نے کچھ اس انداز سے اپنا سر جھٹکا جیسے وہ اپنے آپ سے متنفر ہے۔" جیسا کہ میں عرض کر چکا ہُوں مجھ پر بہت کڑی پابندیاں عائد تھیں۔ وعدہ معاف گواہوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جرجی البتہ میرے مقابلے میں بہت آزاد تھا۔ اس کو رشوت دے دلا کر بہت آسانیاں مہیا تھیں۔ کپڑے مل جاتے تھے۔ صابن مل جاتا تھا۔ بیڑیاں مل جاتی تھیں۔ جیل کے اندر رشوت دینے کے لیے رُوپے بھی مل جاتے تھے —— بھگو بھنگی کی سزا ختم ہونے میں صرف چند دن باقی رہ گئے تھے، جب اُس نے آخری بار جرجی کی دی ہُوئی بیس بیڑیاں مجھے لا کر دیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ جیل سے نکلنے پر خُوش نہیں تھا۔ میں نے جب اُس کو مبارک باد دی تو اُس نے کہا۔" بابو جی! میں پھر آجاؤں گا —— بھُوکے انسان کو چوری کرنی ہی پڑتی ہے —— بالکل ایسے ہی جیسے ایک بھُوکے انسان

کو کھانا کھانا ہی پڑتا ہے ـــــ بابو جی آپ بڑے اچھے ہیں، مجھے اتنی بیڑیاں دیتے رہے ـــــ خُدا کرے آپ کے سارے دوست بری ہو جائیں۔ جرجی بابو آپ کو بہت چاہتے ہیں۔"

نصیر نے یہ سُن کر غالباً اپنے آپ سے کہا۔" اور اس کو صرف ساڑھے تین آنے چُرانے کے جُرم میں سزا ملی تھی۔"

رضوی نے گرم کوفی کا ایک گھونٹ پی کر ٹھنڈے انداز میں کہا۔" جی ہاں صرف ساڑھے تین آنے چُرانے کے جُرم میں ـــــ اور وہ بھی خزانے میں جمع ہیں ـــــ خُدا معلوم اُن سے کس پیٹ کی آگ بُجھے گی!" رضوی نے کوفی کا ایک گھونٹ پیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ہاں منٹو صاحب، اس کی رہائی میں ایک دن رہ گیا تھا۔ مجھے دس روپوں کی اشد ضرورت تھی میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مجھے یہ رُوپے ایک سلسلے میں سنتری کو رشوت کے طور پر دینے تھے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے کاغذ پنسل مہیا کر کے جرجی کو ایک خط لکھا تھا اور بھگو کے ذریعے سے اُس تک بھجوایا تھا۔ کہ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح دس رُوپے بھیج دے۔ بھگو اَن پڑھ تھا۔ شام کو وہ مُجھ سے ملا۔ جرجی کا رقعہ اُس نے مُجھے دیا۔ اُس میں دس رُوپے کا سُرخ پاکستانی نوٹ قید تھا۔ میں نے رقعہ پڑھا۔ یہ لکھا تھا۔ رضوی پیارے دس رُوپے بھیج تو رہا ہُوں، مگر ایک عادی چور کے ہاتھ، خُدا کرے تمہیں مل جائیں۔ کیونکہ یہ کل ہی جیل سے رہا ہو کر جا رہا ہے۔" میں نے یہ تحریر پڑھی تو بھگو بھنگی کی طرف دیکھ کر مُسکرایا۔ اُس کو ساڑھے تین آنے چُرانے کے جُرم میں ایک برس کی سزا ہُوئی تھی۔ میں سوچنے لگا اگر اُس نے دس رُوپے چُرائے ہوتے تو ساڑھے تین آنے فی برس کے حساب سے اُس کو کیا سزا ملتی؟"

یہ کہہ کر رضوی نے کوفی کا آخری گھونٹ پیا اور رُخصت مانگے بغیر کوفی ہاؤس سے باہر چلا گیا۔

(" ٹھنڈا گوشت" سے)

نیا قانُون

منگو کوچوان اپنے اڈّے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اُس نے کبھی اسکول کا مُنہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجُود اُسے دُنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈّے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دُنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُستاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سُنی تھی۔ تو اُس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیشگوئی کی تھی۔ "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔"

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پُوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا۔ "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈّے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حُقّہ پی رہے تھے۔ دل ہی دل میں اُستاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور اُستاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہُوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مُسلم فساد پر تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہُوا تھا حُقے کا دَور چلتے چلتے جب ہندو مُسلم فساد کی بات چھڑی تو اُستاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا۔

"یہ کسی پیر کی بد دُعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مُسلمانوں میں چاقو، چُھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ دُعا دی تھی، جا، تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ——— اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہُوا ہے۔ ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں" یہ کہہ کر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہُوں، اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا، یا وہ رُوس والا جس کی بابت میں نے سُنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے یہ بد دُعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے"۔

اُستاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ تبلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اُسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سُرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اُسے متلی سی آجاتی نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اُن کے لال جُھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم سے اُوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدّر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتا یا حُقے کے کش لگاتے ہُوئے اس "گورے" کو جی بھر

کر سنایا کرتا۔

"........" یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا۔" آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے، یوں رعب گانٹھتے ہیں۔ گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں....."

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اُس کی...... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے —— بالکل مُردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یُوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی۔ کہ ملاعون کی کھوپڑی کے پُرزے اُڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے"...... یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔

قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اُٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہُوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہُوں۔ رگوں میں خُون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آجائے۔"

اور جب ایک روز اُستاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور اُن کی گفتگو سے اُسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے۔ تو اس کی خُوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے۔ گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا —— کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا۔ اور ہندوستانیوں کو آزادی

مل جائے گی۔"

کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت اُستاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بُری طرح پیٹا کرتا تھا۔ مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مُڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک اُنگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اُونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا۔ چل بیٹا —— ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اُس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو مُنہ میں دبا کر اُن کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلافِ معمول اُسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سُنانے والا تھا —— بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بیقراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اُس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اُس کو ایک نئی دُنیا میں لا کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا۔ اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اُس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مُسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر

اُس نے ان مارواڑیوں کو گالی دی۔۔۔۔۔۔" غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل — نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہُوا پانی ہو گا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی۔ جب وہ خیال کرتا کہ گوروں — سفید چوہوں (وہ ان کو اِسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا، پگڑی بغل میں دبائے، اڈے میں داخل ہُوا تو اُستاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا۔" لا ہاتھ اِدھر۔۔۔۔۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خُوش ہو جائے — تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے۔۔۔۔۔۔ مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفتگو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا۔" تو دیکھتا رہ، کیا بنتا ہے، یہ رُوس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

اُستاد منگو موجُودہ سوویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ اور اسے وہاں کے نئے قانُون اور دُوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اِسی لئے اس نے" رُوس والے بادشاہ" کو" انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پُرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں۔ وہ" اُنھیں" رُوس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سُرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں" رُوس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سُنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں۔ یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے اِلزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانُون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اُس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے۔

اور وہ خاموشی سے اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دُوسرے سے کہہ رہا تھا۔

" جدید آئین کا دُوسرا حصّہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دُنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سُنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یُوں کہنا چاہیئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں"! ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہُوئی۔ چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے استاد منگو صرف اُوپر کے جُملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا۔ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانُون کی آمد کو بُرا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اُس کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔ " ٹوڈی بچے"!

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں " ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کرکے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اُس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے اور وہ شریف آدمی اور " ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلبا کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اُس نے اُن تین لڑکوں کو آپس میں باتیں کرتے سُنا۔

" نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں اگر........ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی"۔

" ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آجائے"۔

" ہاں، ہاں، کیوں نہیں"۔

" وہ بیکار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اُن میں کچھ تو کمی ہوگی"۔

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔ اور وہ اس کو ایسی " چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ " نیا قانُون"! وہ دن میں کئی بار سوچتا۔ " یعنی کوئی نئی چیز"! اور ہر بار اُس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آجاتا جو اس نے دو برس ہُوئے

چوہدری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا۔ وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔ پہلی اپریل تک اُستاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سُنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم تھا بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ اور اس کو یقین تھا کہ اُس کی آمد پر جو چیزیں آئیں گی اُن سے اُس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلافِ معمول سرد تھا۔ ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اُٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی —— وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اُس نے صبح کے سرد دُھندلکے میں کئی تنگ اور کُھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اُسے ہر چیز پُرانی نظر آئی —— آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اُس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی، اور سب چیزیں پُرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اُس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱ مارچ کو چوہدری خُدا بخش سے ساڑھے چودہ آنہ میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی........ ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں، لیکن اُستاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دُکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔" اس خیال سے اُسے تسکین

تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ "ہائیکورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا۔ تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے مگر استاد منگو کو نہ جانے اُن کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انار کلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی منیہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑجھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب اُستاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گذارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر اُس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اُوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا۔

" تُو ہر وقت مُردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یُوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

استاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہُوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہشمند

تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگاوتی اس کی اس قسم کی بیقراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی۔

"ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔"

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا ٹھیک اسی طرح جیسے وہ گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس اور ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا۔ اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انار کلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔ کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا ـــــ شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔"

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اتار دیا۔ اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا۔ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا۔ اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئین جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اُسے یُوں معلوم ہُوا جیسے کسی سواری نے اُسے بلایا ہے پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اُسے سڑک کی اُس طرف دُور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بُلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اُس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے پہلے تو اُس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اُس کو خیال آیا۔ "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کلغی پہ جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصُول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں"۔

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اُس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اُس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پہ بیٹھے بیٹھے گورے سے پُوچھا۔

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے"؟

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اُوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی۔ ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا۔ اور اپنے اندر اس نے اِس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہُوا کا رُخ بچا کر سگرٹ سُلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک اُستاد منگو کی اور اس کی نگاہیں چار ہُوئیں اور ایسا معلوم ہُوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اُوپر کو اُڑ گئیں۔

اُستاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اُترنے والا تھا، وہ اپنے سامنے کھڑے گورے کو یُوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجُود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے۔ گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجُود کے کچھ حصّے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گورے نے سگرٹ کا دُھوَاں نگلتے ہُوئے کہا۔ "جانا مانگٹا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے" یہ الفاظ اُستاد منگو کے ذہن میں پیدا ہُوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے" اُس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی دہرائے اور ساتھ ہی اُسے پُورا یقین ہو گیا کہ وُہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہی ہے جس سے پچھلے برس اُس کی جھڑپ ہُوئی تھی اور خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہُوئی شراب تھی۔ اُسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ اُستاد منگو نے گورے کا دماغ دُرست کر دیا ہوتا بلکہ اُس کے پُرزے اڑا دیئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اُس کو معلُوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوان ہی پر گرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانُون پر غور کرتے ہُوئے گورے سے کہا۔ "کہاں جانا مانگٹا ہے؟"

اُستاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا۔ "ہیرا منڈی۔"

"کرایہ پانچ رُوپے ہو گا۔" اُستاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔

یہ سُن کر گورا حیران ہو گیا۔ وُہ چلّایا۔ "پانچ رُوپے۔ کیا تم ——؟"

"ہاں، ہاں، پانچ رُوپے۔" یہ کہتے ہُوئے اُستاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھینچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بیکار باتیں بناؤ گے؟"

اُستاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر اُستاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے اُستاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اُوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اُسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اُس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اُوپر کو اُٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھوڑی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اُس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اُتر کر اُسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔ ششدر اور متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اُس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس چیخ پکار نے اُستاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا۔

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں..... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں — اب ہمارا راج ہے بچہ!"

لوگ جمع ہو گئے اور پُولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو اُستاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ اُستاد منگو اُن دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھُولی ہوئی سانس کی وجہ سے اُوپر نیچے ہو رہی تھی۔ مُنہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مُسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے — اب نیا قانون ہے میاں — نیا قانُون!"

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کے مانند کبھی اُستاد

منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف

اُستاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ "نیا قانون، نیا قانون" چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سُنی۔

"نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو —— قانون وہی ہے پُرانا!"

اور اُس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

(منٹو کے افسانے سے)

"وہ صرف افسانہ نویس ہی نہیں بلکہ ایک باغی بھی تھا،
رجعت پسندی اور رسمی نقطۂ نظر کے خلاف منٹو نے ہمیشہ
بغاوت کی، اس نے اپنے تخیل کو قابلِ قبول بنانے کے لئے کبھی
پردہ یا تمثیل کا سہارا نہیں لیا، اُس نے ہمیشہ بے باکی سے اپنا
نقطۂ نظر پیش کیا"

ممتاز مفتی، (گلِ خنداں منٹو نمبر)

نعرہ

اسے یُوں محسوس ہُوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔

وہ ساتویں منزل سے ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے اترا اور ان تمام منزلوں کا بوجھ اس کے چوڑے مگر دُبلے کاندھے پر سوار ہوتا گیا۔ جب وہ مکان کے مالک سے ملنے کے لئے اُوپر چڑھ رہا تھا تو اسے یُوں محسوس ہُوا تھا کہ اس کا کچھ بوجھ ہلکا ہو گیا ہے اور کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس نے اپنے دل میں سوچا تھا۔ مالک مکان جسے سب سیٹھ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کی بپتا ضرور سُنے گا اور کرایہ چکانے کے لئے اسے ایک مہینے کی اور مہلت بخش دے گا...... بخش دے گا!...... یہ سوچتے ہُوئے اس کے غرور کو ٹھیس لگی تھی لیکن فوراً ہی اس کو اصلیت بھی معلوم ہو گئی تھی...... وہ بھیک مانگنے ہی تو جا رہا تھا اور بھیک ہاتھ پھیلا کر، آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے دُکھ درد سُنا کر اور اپنے گھاؤ دکھا کر ہی مانگی جاتی ہے.....!

اس نے یہی کچھ کیا۔ جب وہ اس سنگین عمارت کے بڑے دروازے میں داخل ہونے لگا تو اس نے اپنے غرور کو، اس چیز کو جو بھیک مانگنے میں عام طور پر رکاوٹ پیدا کیا کرتی

ہے۔ نکال کر فٹ پاتھ پر ڈال دیا تھا۔

وہ اپنا دیا بُجھا کر اور اپنے آپ کو اندھیرے میں لپیٹ کر مالک مکان کے اس روشن کمرے میں داخل ہُوا جہاں وہ اپنی دو بلڈنگوں کا کرایہ وصُول کرتا تھا اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ کے تلک لگے ماتھے پر کئی سلوٹیں پڑ گئیں۔ اس کا بالوں بھرا ہاتھ ایک موٹی سی کاپی کی طرف بڑھا۔ دو بڑی بڑی آنکھوں نے اس کاپی پر کچھ حروف پڑھے اور ایک بھدی سی آواز گونجی۔

کیشو لال..... کھولی پانچویں، دوسرا مالا..... دو مہینوں کا کرایہ.... دے آئے ہو کیا؟

یہ سُن کر اُس نے اپنا دل، جس کے سارے پُرانے اور نئے گھاؤ، وہ سیڑھیاں چڑھتے ہُوئے کرید کرید کر ہرے کر چکا تھا۔ سیٹھ کو دکھانا چاہا۔ اسے پُورا پُورا یقین تھا کہ اُسے دیکھ کر اس کے دل میں ضرور ہمدردی پیدا ہو جائے گی پر... سیٹھ جی نے کچھ سننا نہ چاہا اور اس کے سینے میں ایک ہلڑ سا مچ گیا۔

سیٹھ کے دل میں ہمدردی پیدا کرنے کے لئے اس نے اپنے وہ تمام دُکھ جو بیت چکے تھے۔ گئے گزرے دنوں کی گہری کھائی سے نکال کر اُس نے اپنے دل میں بھر لیتے تھے اور ان تمام زخموں کی جلن جو مُدت ہُوئی مٹ چُکے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے اکٹھی کر کے اپنی چھاتی میں جمع کی تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنی چیزوں کو کیسے سنبھالے؟

اس کے گھر میں بن بلائے مہمان آ گئے ہوتے تو وہ ان سے بڑے روکھے پن سے کہہ سکتا تھا: "جاؤ، میرے پاس اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمہیں بٹھا سکوں اور نہ میرے پاس اتنا رُوپیہ ہے کہ تم سب کی خاطر مدارت کر سکوں"۔ لیکن یہاں تو قصہ ہی دُوسرا تھا۔ اس نے تو اپنے بھوُلے بھٹکے دکھوں کو ادھر اُدھر سے پکڑ کر اپنے سینے میں جمع کیا تھا۔ اب بھلا وہ باہر نکل سکتے تھے؟

افراتفری میں اسے کچھ پتہ نہ چلا تھا کہ اس کے سینے میں کتنی چیزیں بھر گئی ہیں پر

جُوں جُوں اس نے سوچنا شروع کیا۔ وہ پہچاننے لگا کہ فلاں دُکھ فلاں وقت کا ہے اور فلاں درد اُسے فلاں وقت ہُوا تھا اور جب یہ سوچ بچار شروع ہُوئی تو حافظے نے بڑھ کر وہ دُھند ہٹا دی جو ان پر لپٹی ہُوئی تھی اور کل کے تمام درد آج کی تکلیفیں بن گئے اور اس نے اپنی زندگی کی باسی روٹیاں پھر انگاروں پر سینکنا شروع کر دیں۔

اس نے سوچا، تھوڑے سے وقت میں اس نے بہت کُچھ سوچا۔ اس کے گھر کا اندھا لیمپ کئی بار اس کے پیوند لگے کپڑے ان کھونٹیوں پر لٹک کر پھر اس کے میلے بدن سے چمٹ گئے جو دیوار میں گڑی چمک رہی تھیں۔ کئی بار اسے ان داتا بھگوان کا خیال آیا جو بہت دُور نہ جانے کہاں بیٹھا اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے مگر اپنے سامنے سیٹھ کو کُرسی پر بیٹھا دیکھ کر جس کے قلم کی ایک جنبش کُچھ کا کُچھ کر سکتی تھی۔ وہ اس بارے میں کُچھ بھی نہ سوچ سکا۔ کئی بار اُسے خیال آیا اور وُہ سوچنے لگا کہ اسے کیا خیال آیا تھا مگر وہ اس کے پیچھے بھاگ دوڑ نہ کر سکا۔ وہ سخت گھبرا گیا تھا۔ اس نے آج تک اپنے سینے میں اتنی کھلبلی نہیں دیکھی تھی۔

وہ اس کھلبلی پر ابھی تعجب ہی کر رہا تھا کہ مالک مکان نے غصے میں آکر اُسے گالی دی گالی ۔۔۔۔ یُوں سمجھیے کہ کانوں کے راستے پگھلا ہُوا سیسہ شائیں شائیں کرتا اس کے دل میں اُتر گیا۔ اور اس کے سینے کے اندر جو ہلڑ مچ گیا۔ اس کا تو کُچھ ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ جس طرح کسی گرما گرم جلسے میں کسی شرارت سے بھگدڑ مچ جایا کرتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس کے دل میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس نے بہت جتن کیے کہ اس کے وہ دُکھ درد جو اس نے سیٹھ کو دکھانے کے لیے اکٹھے کیے تھے چُپ چاپ رہیں۔ پر کُچھ نہ ہو سکا۔ گالی کا سیٹھ کے مُنہ سے نکلنا تھا کہ تمام بے چین ہو گئے۔ اور اندھا دُھند ایک دُوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ اب تو وہ یہ نئی تکلیف بالکل نہ سہہ سکا اور اس کی آنکھوں میں جو پہلے ہی سے تپ رہی تھیں۔ آنسو آگئے جس سے ان کی گرمی اور بھی بڑھ گئی اور ان سے دُھواں نکلنے لگا۔

اس کے جی میں آئی کہ اس گالی کو جسے وہ بڑی حد تک نگل چکا تھا۔ سیٹھ کے جُھریاں

پڑے چہرے پر تھوک دے مگر وہ اس خیال سے باز آ گیا کہ اُس کا غرور تو باہر فٹ پاتھ پر پڑا ہے۔

اپولو بندر پر نمک لگی مونگ پھلی بیچنے والے کا غرور۔۔۔۔۔۔ اُس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں اور ان کے سامنے نمک لگی مونگ پھلی کے وہ تمام دانے جو اس کے گھر میں ایک تھیلے کے اندر رکھا کے باعث گیلے ہو رہے تھے ناچنے لگے۔

اس کی آنکھیں ہنسیں اس کا دل بھی ہنسا، یہ سب کچھ ہُوا، پر وہ کڑواہٹ دُور نہ ہُوئی جو اس کے گلے میں سیٹھ کی گالی نے پیدا کر دی تھی۔ یہ کڑواہٹ اگر صرف زبان پر ہوتی تو وہ اسے تھوک دیتا مگر وہ تو بہت بُری طرح اس کے گلے میں اٹک گئی تھی اور نکالے نہ نکلتی تھی اور پھر ایک عجیب قسم کا دُکھ جو اس گالی نے پیدا کر دیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ کو اور بھی بڑھا رہا تھا۔ اسے یُوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں جو سیٹھ کے سامنے رونا فضول سمجھتی تھیں۔ اس کے سینے کے اندر اُتر کر آنسو بہا رہی ہیں۔ جہاں ہر چیز پہلے ہی سے سوگ میں تھی۔

سیٹھ نے اسے پھر گالی دی۔ اتنی ہی موٹی جتنی اس کی چربی بھری گردن تھی اور اسے یُوں لگا کہ کسی نے اُوپر سے اس پر کوڑا کرکٹ پھینک دیا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک ہاتھ اپنے آپ چہرے کی طرف حفاظت کے لئے بڑھا پر اس کی ساری گردا س پر پھیل چکی تھی۔۔۔۔۔ اسے کچھ خبر نہ تھی۔۔۔۔۔۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ایسی حالتوں میں ایسی حالتوں میں کسی بات کی سُدھ بُدھ نہیں رہا کرتی۔

وہ جب نیچے اُترا تو اسے ایسا محسوس ہُوا کہ اس سنگین عمارت کی ساتوں منزلیں اس کے کاندھوں پر دھر دی گئی ہیں۔

ایک نہیں، دو گالیاں۔۔۔۔۔ بار بار دو گالیاں جو سیٹھ نے بالکل پان کی پیک کے مانند اپنے مُنہ سے اُگل دی تھیں۔ اس کے کانوں کے پاس زہریلی بھڑوں کی طرح بھنبھنانا شروع کر دیتی تھیں اور وہ سخت بے چین ہو جاتا تھا۔ وہ کیسے اس۔۔۔۔ اس۔۔۔۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس گڑبڑ کا نام کیا رکھے جو اس کے دل میں اور دماغ میں ان

گالیوں نے مچا رکھی تھی۔ وہ کیسے اس تپ کو دُور کر سکتا تھا جس میں وہ پھنکا جا رہا تھا۔ کیسے؟....
پر وہ سوچ بچار کے قابل بھی تو نہیں رہا تھا۔ اس کا دماغ تو اس وقت ایک ایسا اکھاڑا بنا ہُوا تھا جس میں بہت سے پہلوان کُشتی لڑ رہے ہوں جو خیال بھی وہاں پیدا ہوتا۔ کسی دُوسرے خیال سے جو پہلے ہی سے وہاں موجُود ہوتا بھڑ جاتا اور وہ کچھ سوچ نہ سکتا۔

چلتے چلتے جب ایکا ایکی اس کے دُکھ قے کی صُورت میں باہر نکلنے کو تھے۔ اس کے جی میں آئی۔ جی میں کیا آئی۔ مجبُوری کی حالت میں وہ اس آدمی کو روک کر جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پاس سے گزر رہا تھا۔ یہ کہنے ہی والا تھا۔ "بھتیا میں روگی ہُوں"۔ مگر جب اس نے راہ چلتے آدمی کی شکل دیکھی تو بجلی کا وہ کھمبا جو اس کے پاس ہی زمین پر گڑا تھا۔ اسے اس آدمی سے کہیں زیادہ حساس دکھائی دیا اور جو کچھ وہ اپنے اندر سے باہر نکالنے والا تھا۔ ایک ایک گھونٹ کر کے پھر نگل گیا۔

فٹ پاتھ میں چوکور پتھر ایک ترتیب کے ساتھ جُڑے ہُوئے تھے۔ وہ ان پتھروں پر چل رہا تھا۔ آج تک کبھی اس نے ان کی سختی محسوس نہ کی تھی مگر آج ان کی سختی اس کے دل تک پہنچ رہی تھی۔ فٹ پاتھ کا ہر ایک پتھر جس پر اس کے قدم پڑ رہے تھے۔ اس کے دل کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ ... سیٹھ کے پتھر کے مکان سے نکل کر ابھی تھوڑی ہی دُور گیا ہو گا کہ اس کا بند بند ڈھیلا ہو گیا۔

چلتے چلتے اس کی ایک لڑکی سے ٹکر ہُوئی اور اسے یُوں محسوس ہُوا کہ وہ ٹُوٹ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے جھٹ اس آدمی کی طرح جس کی جھولی سے بیر گر رہے ہوں۔ اِدھر اُدھر اپنے ہاتھ پھیلائے اپنے آپ کو اکٹھا کر کے ہولے ہولے چلنا شرُوع کیا۔

اس کا دماغ اس کی ٹانگوں کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ چل رہا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی چلتے چلتے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ سارے کا سارا بہت پیچھے رہ گیا ہے اور دماغ بہت آگے نکل گیا۔ کئی بار اسے اس خیال سے ٹھہرنا پڑا کہ دونوں چیزیں ایک دُوسرے

کے ساتھ ساتھ ہو جائیں۔

وہ فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ جس کے اس طرف سڑک پر پوں پوں کرتی موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ گھوڑے، گاڑیاں، ٹرامیں، بھاری بھرکم ٹرک، لاریاں یہ سب سڑک کی گالی چھاتی پر دندناتی ہوئی چل رہی تھیں۔ ایک شور مچا ہوا تھا، پر اس کے کانوں کو کچھ سنائی نہ دیتا تھا وہ تو پہلے ہی سے شائیں شائیں کر رہے تھے جیسے ریل گاڑی کا انجن زائد بھاپ باہر نکال رہا ہے۔

چلتے چلتے ایک لنگڑے کتے سے اس کی ٹکر ہوئی۔ کتے نے اس خیال سے کہ شاید اس کا زخمی پیر کچل دیا گیا ہے "چاؤں" کیا اور پرے ہٹ گیا اور وہ سمجھا کہ سیٹھ نے اسے پھر گالی دی ہے ...... گالی ...... ٹھیک اسی طرح اس سے الجھ کر رہ گئی تھی۔ جیسے جھاڑی کے کانٹوں میں کوئی کپڑا۔ وہ جتنی کوشش اپنے آپ کو چھڑانے کی کرتا تھا۔ اتنی زیادہ اس کی روح زخمی ہوتی جا رہی تھی۔

اسے اس نمک لگی مونگ پھلی کا خیال نہیں تھا۔ جو اس کے گھر میں پر کھل کے باعث گیلی ہو رہی تھی اور نہ اسے روٹی کپڑے کا خیال تھا۔ اس کی عمر تیس برس کے قریب تھی اور ان تیس برسوں میں جن کے پرماتما جانے کتنے دن ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بھوکا نہ سویا تھا اور نہ کبھی ننگا ہی پھرا تھا۔ اسے صرف اس بات کا دکھ تھا کہ اسے ہر مہینے کرایہ دینا پڑتا تھا۔ وہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے اس بکرے جیسی داڑھی والے حکیم کی دوائیوں کے دام دے شام کو تاڑی کی ایک بوتل کے لئے دوئنی پیدا کرے یا اس گنجے سیٹھ کے مکان کے ایک کمرے کا کرایہ ادا کرے۔ مکان اور کرایوں کا فلسفہ اس کی سمجھ سے سدا اونچا رہا تھا۔ وہ جب بھی دس روپے گن کر سیٹھ یا اس کے منیم کی ہتھیلی پر رکھتا تو سمجھتا کہ زبردستی اس سے یہ رقم چھین لی گئی ہے اور اب اگر وہ پانچ برس تک برابر کرایہ دیتے رہنے کے بعد صرف دو مہینے کا حساب چکتا نہ کر سکا تو کیا سیٹھ کو اس بات کا اختیار ہو گیا کہ وہ اسے گالی دے؟ سب سے بڑی بات تو

یہی تھی جو اُسے کھائے جارہی تھی۔ اسے ان بیس روپوں کی پروا نہ تھی جو اسے آج نہیں کل ادا کر دینے تھے۔ وہ ان دو گالیوں کی بابت سوچ رہا تھا جو ان بیس رُوپلی کے بیچ میں سے نکلی تھیں۔ نہ وہ بیس رُوپے کا مقروض ہوتا اور نہ سیٹھ کے کٹھالی جیسے مُنہ سے یہ گندگی باہر نکلتی۔

مان لیا وہ دھنوان تھا۔ اس کے پاس دو بلڈنگیں تھیں۔ جن کے ایک سو چوبیس کمروں کا کرایہ اس کے پاس آتا تھا۔ پر ان ایک سو چوبیس کمروں میں جتنے لوگ رہتے ہیں اس کے غلام تو نہیں اور اگر غلام بھی ہیں تو وہ اُنہیں گالی کیسے دے سکتا ہے۔؟

" ٹھیک ہے، اسے کرایہ چاہیئے، پر میں کہاں سے لاؤں۔ پانچ برس تک اس کو دیتا ہی رہا ہُوں۔ جب ہوگا، دے دوں گا۔ پچھلے برس برسات کا سارا پانی ہم پر ٹپکتا رہا۔ پر میں نے اُسے کبھی گالی نہ دی، حالانکہ مجھے اس سے کہیں زیادہ ہولناک گالیاں یاد ہیں۔ میں نے سیٹھ سے ہزار بار کہا کہ سیڑھی کا ڈنڈا ٹوٹ گیا ہے۔ اسے بنوا دیجئے۔ پر میری ایک نہ سُنی گئی۔ میری پھُول سی بچّی گری۔ اس کا داہنا ہاتھ ہمیشہ کے لیئے بے کار ہو گیا۔ میں گالیوں کے بجائے اسے بد دُعا دے سکتا تھا۔ پر مُجھے اس کا دھیان ہی نہیں آیا۔ . . . . دو مہینے کا کرایہ نہ چکانے پر میں گالیوں کے قابل ہو گیا۔ اس کو یہ خیال تک نہ آیا کہ اس کے بچے اپولو بندر پر میرے تھیلے سے مٹھیاں بھر بھر کے مُونگ پھلی کھاتے ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے پاس پاس اتنی دولت نہیں تھی۔ جتنی کہ اس دو بلڈنگوں والے سیٹھ کے پاس تھی اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کے پاس اس سے بھی زیادہ دولت ہو گی، پر وہ غریب کیسے ہو گیا؟ . . . . . اسے غریب سمجھ کر ہی تو گالی دی گئی تھی۔ ورنہ اس گنجے سیٹھ کی کیا مجال تھی کہ کرسی پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اُسے دو گالیاں سُنا دیتا۔ گویا کسی کے پاس دھن دولت کا نہ ہونا بہت بُری بات ہے۔ اب یہ اس کا قصور نہیں تھا کہ اس کے پاس دولت کی کمی تھی۔ سچ پُوچھیئے تو اس نے کبھی دھن دولت کے خواب دیکھے ہی نہ تھے۔ وہ اپنے حال میں مست تھا۔ اس کی زندگی بڑے مزے میں گزر رہی تھی۔ پر پچھلے مہینے ایکا ایکی اس

کی بیوی بیار پڑ گئی اور اس کے دوا دارو پر وہ تمام روپے خرچ ہو گئے جو کرائے میں جانے والے تھے۔ اگر وہ خود بیمار ہوتا تو ممکن تھا کہ دواؤں پر روپیہ خرچ نہ کرتا۔ لیکن یہاں تو اس کے ہونے والے بچے کی بات تھی جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ ہی میں تھا۔ اس کو اولاد بہت پیاری تھی جو پیدا ہو چکی تھی اور جو پیدا ہونے والی تھی۔ سب کی سب اسے عزیز تھی۔ وہ کیسے اپنی بیوی کا علاج نہ کراتا؟...... کیا وہ اس بچے کا باپ نہ تھا؟..... باپ بتا... وہ تو صرف دو مہینے کے کرائے کی بات تھی۔ اگر اسے اپنے بچے کے لئے چوری بھی کرنا پڑتی تو وہ کبھی نہ چوکتا.......

چوری، نہیں نہیں وہ چوری کبھی نہ کرتا...... یوں سمجھئے کہ وہ اپنے بچے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر وہ چور کبھی نہ بنتا...... وہ اپنی چھینی ہوئی چیز واپس لینے کے لئے لڑنے مرنے کو تیار تھا۔ پر وہ چوری نہیں کر سکتا تھا۔

اگر وہ چاہتا تو اس وقت جب سیٹھ نے اسے گالی دی تھی۔ آگے بڑھ کر اس کا ٹینٹوا دبا دیتا اور اس تجوری میں سے وہ تمام نیلے اور سبز نوٹ نکال کر بھاگ جاتا۔ جن کو وہ آج تک لاجونتی کے پتے سمجھا کرتا تھا.... نہیں نہیں وہ ایسا کبھی نہ کرتا۔ لیکن پھر سیٹھ نے اسے گالی کیوں دی؟...... پچھلے برس چوپاٹی پر ایک گاہک نے اسے گالی دی تھی۔ اس لئے کہ دو پیسے کی مونگ پھلی میں چار دانے کڑوے چلے گئے تھے۔ اور اس کے جواب میں اس کی گردن پر ایسی دھول جمائی تھی کہ دور بنچ پر بیٹھے آدمیوں نے بھی اس کی آواز سن لی تھی مگر سیٹھ نے اسے دو گالیاں دیں اور وہ چپ رہا..... کیشو لال کھاری سینگ والا جس کی بابت یہ مشہور تھا کہ وہ ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا.... سیٹھ نے ایک گالی دی اور وہ کچھ نہ بولا..... دوسری گالی دی تو بھی وہ خاموش رہا۔ جیسے وہ مٹی کا پتلا ہے..... پر مٹی کا پتلا کیسے ہوا؟ اس نے ان دو گالیوں کو سیٹھ کے تھوک بھرے منہ سے نکلتے دیکھا جیسے دو بڑے بڑے چوہے موریوں سے باہر نکلتے ہیں، وہ جان بوجھ کر خاموش رہا اس لئے کہ

وہ اپنا غرور نیچے چھوڑ آیا تھا۔۔۔ مگر اس نے اپنا غرور اپنے سے بیوں الگ کیا؟ سیٹھ سے گالیاں لینے کے لیے؟

یہ سوچتے ہوئے اسے ایکا ایکی خیال آیا کہ شاید سیٹھ نے اسے نہیں کسی اور کو گالیاں دی تھیں۔۔۔۔ نہیں، نہیں، گالیاں اسے ہی دی گئی ہوتیں۔ تو اس سوچ بچار کی ضرورت ہی کیا تھی اور یہ جو اس کے سینے میں ہلڑ سا مچ رہا تھا۔ کیا بغیر کسی وجہ کے اسے دکھ دے رہا تھا؟ اسی کو دو گالیاں دی گئی تھیں۔

جب اس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں۔۔۔۔ گالیاں۔۔۔ گالیاں۔۔۔۔ وہ جھنجھلا گیا۔۔۔۔ وہ جتنی کوشش کرتا تھا کہ ان گالیوں کی بابت نہ سوچے اتنی ہی شدت سے اسے ان کے متعلق سوچنا پڑتا تھا اور یہ مجبوری اسے بہت چڑچڑا بنا رہی تھی۔ چنانچہ اس چڑچڑے پن میں اس نے خواہ مخواہ دو تین آدمیوں کو جو اس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ دل ہی دل میں گالیاں دیں۔ یوں اکڑ کے چل رہے ہیں۔ جیسے ان کے باوا کا راج ہے!

اگر اس کا راج ہوتا تو وہ سیٹھ کو مزا چکھا دیتا جو اسے اوپر تلے دو گالیاں سنا کر اپنے گھر میں یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے اس نے اپنی گدے دار کرسی میں سے دو کھٹمل نکال کر باہر پھینک دیئے ہیں۔۔۔۔ سچ مچ اگر اس کا اپنا راج ہوتا تو وہ چوک میں بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر کے سیٹھ کو بیچ میں کھڑا کر دیتا اور اس کی گنجی چندیا پر اس زور سے دھپا مارتا کہ بلبلا اٹھتا، پھر وہ سب لوگوں سے کہتا کہ ہنسو، جی بھر کر ہنسو اور خود اتنا ہنستا کہ ہنستے ہنستے اس کا پیٹ دکھنے لگتا۔۔۔۔ پر اس وقت اسے بالکل ہنسی نہیں آئی تھی۔۔۔۔ کیوں؟ وہ اپنے راج کے بغیر بھی تو سیٹھ کے گنجے سر پر دھپا مار سکتا تھا۔ اسے کس بات کی رکاوٹ تھی؟۔۔۔۔ رکاوٹ تھی۔۔۔۔۔۔ رکاوٹ تھی تو وہ گالیاں سن کر خاموش ہو رہا۔

اس کے قدم رک گئے۔ اس کا دماغ بھی ایک دو پل کے لیے ستایا اور اس نے سوچا کہ

چلو ابھی اس جھنجھٹ کا فیصلہ ہی کر دوں...... بھاگا ہُوا جاؤں اور ایک ہی جھٹکے میں سیٹھ کی گردن مروڑ کر اس تجوری پر رکھ دوں جس کا ڈھکنا مگرمچھ کے مُنہ کی طرح کھلتا ہے.... لیکن وہ کھمبے کی طرح زمین میں کیوں گڑ گیا تھا؟ سیٹھ کے گھر کی طرف پلٹا کیوں نہیں تھا؟.... کیا اس میں جرأت نہ تھی؟۔

اس میں جرأت نہ تھی..... کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس کی ساری طاقت سرد پڑ گئی تھی ......یہ گالیاں...... وہ ان گالیوں کو کیا کہتا..... ان گالیوں نے اس کی چوڑی چھاتی پر رولسا پھیر دیا تھا...... صرف دو گالیوں نے...... حالانکہ پچھلے ہندو مُسلم فساد میں ایک ہندو نے اسے مُسلمان سمجھ کر لاٹھیوں سے بہت پیٹا تھا اور ادھ مُوا کر دیا تھا اور اسے اتنی تکلیف محسوس نہ ہُوئی تھی جتنی کہ اب ہو رہی تھی..... کیشو لال کھاری سینگ والا جو اپنے دوستوں سے بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ کبھی بیمار نہیں پڑا۔ آج یُوں چل رہا تھا جیسے برسوں کا روگی ہے.... اور یہ روگ کس نے پیدا کیا تھا؟..... دو گالیوں نے!

گالیاں.... گالیاں.... کہاں تھیں وہ دو گالیاں؟ اس کے جی میں آئی کہ اپنے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر وہ ان دو پتھروں کو جو کسی حیلے گلتے ہی نہ تھے۔ باہر نکال لے اور جو کوئی بھی اس کے سامنے آئے اس کے سر پر دے مارے، پر یہ کیسے ہو سکتا تھا..... اس کا سینہ مُربّے کا مرتبان تھوڑی تھا۔

ٹھیک ہے، لیکن پھر کوئی اور ترکیب بھی تو سمجھ میں آتے۔ جس سے یہ گالیاں دُور دفع ہوں..... کیوں نہیں کوئی شخص بڑھ کر اسے دُکھ سے نجات دلانے کی کوشش کرتا؟ کیا وہ ہمدردی کے قابل نہ تھا؟...... ہو گا، پر کسی کو اس کے دل کے حال کا کیا پتہ تھا۔ وہ کھُلی کتاب تھوڑی تھا اور نہ اس نے اپنا دل باہر لٹکا رکھا تھا۔ اندر کی بات کسی کو کیا معلوم؟۔

نہ معلوم ہو!..... پرماتما کرے کسی کو معلوم نہ ہو..... اگر کسی کو اندر کی بات کا پتہ چل گیا تو کیشو لال کھاری سینگ والے کے لئے ڈوب مرنے کی بات تھی...... گالیاں سُن کر

خاموش رہنا معمولی بات تھی کیا؟

معمولی بات نہیں بہت بڑی بات ہے...... ہمالہ پہاڑ جتنی بات ہے۔ اس سے بھی بڑی بات ہے۔ اس کا غرور مٹی میں مل گیا۔ اس کی ذلت ہوئی ہے...... اس کی ناک کٹ گئی ہے...... اس کا سب کچھ لٹ گیا ہے۔ چلو بھئی چھٹی ہوئی۔ اب تو یہ گالیاں اس کا پیچھا چھوڑ دیں...... وہ کمینہ تھا۔ رذیل تھا۔ نیچ تھا۔ گندگی صاف کرنے والا بھنگی تھا، کتا تھا...... اس کو گالیاں ملنا ہی چاہیئے تھیں...... نہیں نہیں۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ اسے گالیاں دے اور پھر بغیر کسی قصور کے وہ اسے کچا نہ چبا جاتا...... اماں ہٹاؤ، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں...... تم نے تو سیٹھ سے یوں گالیاں سنیں جیسے میٹھی میٹھی بولیاں تھیں۔

"میٹھی میٹھی بولیاں تھیں، بڑے مزیدار گھونٹ تھے، چلو یہی سہی...... اب تو میرا پیچھا چھوڑ دو، ورنہ سچ کہتا ہوں، دیوانہ ہو جاؤں گا۔ یہ لوگ جو بڑے آرام سے ادھر سے اُدھر چل رہے ہیں۔ میں ان میں سے ہر ایک کا سر پھوڑ دوں گا۔ بھگوان کی قسم مجھے اب زیادہ تاب نہیں رہی۔ میں ضرور دیوانے کُتے کی طرح سب کو کاٹنا شروع کر دوں گا۔ لوگ مجھے پاگل خانے میں بند کر دیں گے اور میں دیواروں کے ساتھ اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر مر جاؤں گا...... مر جاؤں گا، سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا...... مر جاؤں گا، سچ کہتا ہوں، مر جاؤں گا اور میری رادھا ودھوا اور میرے بچے اناتھ ہو جائیں گے...... یہ سب کچھ اس لئے ہو گا کہ میں نے سیٹھ سے دو گالیاں سنیں اور خاموش رہا جیسے میرے منہ پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں لولا۔ لنگڑا، اپاہج تھا...... پرماتما کرے میری ٹانگیں اس موٹر کے نیچے آ کر ٹوٹ جائیں۔ میرے ہاتھ کٹ جائیں۔ میں مر جاؤں تاکہ یہ بک بک تو ختم ہو...... توبہ...... کوئی ٹھکانہ ہے اس دکھ کا کپڑے پھاڑ کر ننگا ناچنا شروع کر دوں...... اس ٹرام کے نیچے سر دے دوں، زور زور سے چلانا شروع کر دوں...... کیا کروں کیا نہ کروں"؟

یہ سوچتے ہوئے اسے ایکا ایکی خیال آیا کہ بازار کے بیچ کھڑا ہو جائے اور سب ٹریفک کو روک کر جو اس کی زبان پر آئے بکتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ اس کا سینہ سارے کا سارا خالی

ہو جائے، یا پھر اس کے جی میں آئی کہ کھڑے کھڑے یہیں سے چلانا شروع کردے۔ ”مجھے بچاؤ.... مجھے بچاؤ!“

اتنے میں ایک آگ بجھانے والا انجن سڑک پر ٹن ٹن کرتا آیا اور ادھر اس موڑ میں گم ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر وہ اونچی آواز میں کہنے ہی والا تھا ”ٹھہرو.... میری آگ بجھاتے جاؤ۔ مگر نہ جانے کیوں رک گیا۔

ایکا ایکی اس نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی سانس رکنے لگی ہے اور اگر وہ تیز نہ چلے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ پھٹ جائے۔ لیکن جوں ہی اس کی رفتار بڑھی۔ اس کا دماغ آگ کا ایک چکر سا بن گیا۔ اس چکر میں اس کے سارے پرانے اور نئے خیال ایک ہار کی صورت میں گندھ گئے..... دو مہینے کا کرایہ اس کا پتھر کی بلڈنگ میں درخواست لے کر جانا..... سات منزلوں کے ایک سو بارہ زینے، سیٹھ کی بھدی آواز، اس کے گنجے سر پر مسکراتا ہوا بجلی کا لیمپ اور..... یہ موٹی گالی..... پھر دوسری..... اور اس کی خاموشی..... یہاں پہنچ کر آگ کے اس چکر میں تڑ تڑ گولیاں سی نکلنا شروع ہو جاتیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا سینہ چھلنی ہو گیا ہے۔

اس نے اپنے قدم اور تیز کئے اور آگ کا یہ چکر اتنی تیزی سے گھومنا شروع ہوا کہ شعلوں کی ایک بہت بڑی گیند سی بن گئی جو اس کے آگے آگے زمین پر اچھلنے کودنے لگی۔ وہ اب دوڑنے لگا۔ لیکن فوراً ہی خیالوں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک نیا خیال بلند آواز میں چلایا ”تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ کس سے بھاگ رہے ہو؟ تم بزدل ہو؟!“

اس کے قدم آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔ بریک سی لگ گئی اور ہولے ہولے چلنے لگا..... وہ سچ مچ بزدل تھا..... بھاگ کیوں رہا تھا؟..... اسے تو انتقام لینا تھا..... انتقام ..... یہ سوچتے ہوئے اسے اپنی زبان پر لہو کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا اور اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی..... لہو..... لہو۔ اسے آسمان زمین لہو ہی میں رنگے ہوئے نظر

آنے لگے...... لہو...... اس وقت اس میں اتنی قوت تھی کہ پتھر کی رگوں میں بھی لہو نچوڑ سکتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں لال ڈورے اُبھر آتے۔ مُٹھیاں بھنچ گئیں اور قدموں میں مضبوطی پیدا ہو گئی....... اب وہ انتقام پر تُل گیا تھا۔

وہ بڑھا

آنے جانے والے لوگوں میں سے تیر کے مانند اپنا راستہ بناتا آگے بڑھتا رہا۔ آگے .... آگے!

جس طرح تیز چلنے والی ریل گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو چھوڑ جایا کرتی ہے۔ اسی طرح وہ بجلی کے کھمبوں، دوکانوں اور لمبے لمبے بازاروں کو اپنے پیچھے چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا۔ آگے..... آگے..... بہت آگے!

راستے میں ایک سینما کی رنگین بلڈنگ آئی۔ اس نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اس کے پاس سے بے پروا، ہوا کے مانند بڑھ گیا۔

وہ بڑھتا گیا۔

اندر ہی اندر اس نے اپنے ہر ذرّے کو ایک بم بنا لیا تھا تاکہ وقت پر کام آئے۔ مختلف بازاروں سے زہریلے سانپ کی مانند پھنکارتا ہوا وہ اپولو بندر پہنچا..... اپولو.. گیٹ وے آف انڈیا کے سامنے بے شمار موٹریں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ ان کو دیکھ کر اس نے یہ سمجھا کہ بہت سے گدھ پر جوڑے کسی لاش کے ارد گرد بیٹھے ہیں۔ جب اس نے خاموش سمندر کی طرف دیکھا تو اسے یہ ایک لمبی چوڑی لاش معلوم ہوئی..... اس سمندر کے اس طرف ایک کونے میں لال لال روشنی کی لکیریں ہولے ہولے بل کھا رہی تھیں۔ یہ ایک عالی شان ہوٹل کی پیشانی کا برقی نام تھا۔ جس کی لال روشنی سمندر کے پانی میں گدگدی پیدا کر رہی تھی

کیشو لال کھاری سینگ والا اس عالی شان ہوٹل کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس برقی بورڈ کے عین نیچے قدم گاڑ کر اس نے اُوپر دیکھا.... سنگین عمارت کی فطرت جس کے روشن کمرے

چمک رہے تھے اور...... اس کے حلق سے ایک نعرہ.... کان کے پردے پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا... ہت تیری.....!

جتنے کبوتر ہوٹل کی منڈیروں پر اونگھ رہے تھے، ڈر گئے اور پھڑپھڑانے لگے۔ نعرہ مار کر جب اس نے اپنے قدم زمین سے بڑی مشکل کے ساتھ علیحدہ کئے اور واپس مڑا تو اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہوٹل کی سنگین عمارت اڑ اڑا دھم نیچے گر گئی ہے۔

اور یہ نعرہ سن کر ایک شخص نے اپنی بیوی سے جو یہ شور سن کر ڈر گئی تھی، کہا "پگلا ہے"!

(منٹو کے افسانے، ۱۹۴۰ء)

بانجھ

میری اور اس کی ملاقات آج سے ٹھیک دو برس پہلے اپولو بندر ہوئی۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی آخری کرنیں سمندر کی ان دور دراز لہروں کے پیچھے غائب ہو چکی تھیں۔ جو ساحل کے بنچ پر بیٹھ کر دیکھنے سے موٹے کپڑے کی تہیں معلوم ہوتی تھیں۔ میں گیٹ وے آف انڈیا کے اس طرف پہلا بنچ چھوڑ کر جس پر ایک آدمی چمپی والے سے اپنے سر کی مالش کرا رہا تھا۔ دوسرے بنچ پر بیٹھا تھا اور حدِ نظر تک پھیلتے ہوئے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ دور بہت دور، جہاں سمندر اور آسمان گھل مل رہے تھے۔ بڑی بڑی لہریں آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا گدلے رنگ کا قالین ہے۔ جسے اِدھر سے اُدھر سمیٹا جا رہا ہے۔

ساحل کے سب قمقمے روشن تھے جن کا عکس کنارے کے لرزاں پانی پر لچکپاتی ہوئی موٹی موٹی لکیروں کی صورت میں جگہ جگہ رینگ رہا تھا۔ میرے پاس پتھریلی دیوار کے نیچے کئی کشتیوں کے لپٹے ہوئے بادبان اور بانس ہولے ہولے حرکت کر رہے تھے۔ سمندر کی لہروں اور تماشائیوں کی آواز ایک گنگناہٹ بن کر فضا میں گھلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کسی آنے یا جانے والی موٹر کے ہارن کی آواز بلند ہوتی اور یوں معلوم ہوتا کہ بڑی دلچسپ کہانی سننے کے دوران میں کسی نے زور سے "ہُوں" کی ہے۔

ایسے ماحول میں سگریٹ پینے کا بہت مزہ آتا ہے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیہ نکالی مگر ماچس نہ ملی۔ جانے کہاں بھول آیا تھا۔ سگریٹ کی ڈبیا واپس جیب میں رکھنے ہی والا تھا کہ پاس سے کسی نے کہا۔ "ماچس لیجئے گا"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ بنچ کے پیچھے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ یوں تو بمبئی کے عام باشندوں کا رنگ زرد ہوتا ہے۔ لیکن اس کا چہرہ خوفناک طور پر زرد تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ "آپ کی بڑی عنایت ہے"

یہ سُن کر اس نے ماچس کی ڈبیا جو اس کے ہاتھ ہی میں تھی۔ میری طرف بڑھا دی میں نے پھر شکریہ ادا کیا اور کہا۔ "تشریف رکھیئے"

اس نے جواب دیا۔ "آپ سگریٹ سُلگا لیجئے، مجھے جانا ہے"

مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ اس نے جھُوٹ بولا ہے۔ کیونکہ اس کے لہجے سے اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ اُسے کوئی جلدی نہیں ہے اور نہ اُسے کہیں جانا ہے۔

آپ کہیں گے کہ لہجے سے ایسی باتوں کا پتہ کیسے چل سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس وقت ایسا ہی محسوس ہُوا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر کہا۔ "ایسی جلدی کیا ہے.... تشریف رکھیئے" اور یہ کہہ کر میں نے سگریٹ کی ڈبیہ اس طرف بڑھا دی۔ "شوق فرمایئے"

اس نے سگریٹ کے چھاپ کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔ "شکریہ۔ میں صرف اپنا برانڈ پیا کرتا ہُوں"

آپ مانیں یا مانیں۔ مگر میں قسمیہ کہتا ہُوں کہ اس بار اس نے پھر جھُوٹ بولا۔ اس مرتبہ پھر اس لہجے نے چغلی کھائی اور مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس لئے کہ میں نے اپنے دل میں قصد کر لیا تھا کہ اسے ضرور اپنے پاس بٹھاؤں گا۔ اور اپنا سگریٹ پلواؤں گا۔ میرے خیال کے مطابق اس میں مُشکل کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ کیونکہ اس کے دو جُملوں ہی نے مجھے بتا دیا تھا کہ وُہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ میرے پاس بیٹھے اور سگریٹ

پیئے۔ لیکن بیک وقت اس کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ میرے پاس نہ بیٹھے اور میرا سگریٹ نہ پیئے۔ چنانچہ ہاں اور نہ کا یہ تصادم اس کے لہجے میں صاف طور پر مجھے نظر آیا تھا۔ آپ یقین جانیئے کہ اس کا وجود بھی ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں لٹکا ہوا تھا۔

اس کا چہرہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ بے حد پتلا تھا۔ اس پر اس کی ناک آنکھوں اور منہ کے خطوط اس قدر مدھم تھے جیسے کسی نے تصویر بنائی ہے اور اس کو پانی سے دھو ڈالا ہے۔ کبھی کبھی اس کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کے ہونٹ ابھر سے آتے۔ لیکن پھر راکھ میں لپٹی ہوئی چنگاری کی مانند سو جاتے۔ اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کا بھی یہی حال تھا۔ آنکھیں گدلے پانی کی دو بڑی بڑی بوندیں تھیں جن پر اس کی چھدری پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ بال کالے تھے مگر ان کی سیاہی جلے ہوئے کاغذ کے مانند تھی جن میں بھوسلا پن بھی ہوتا ہے۔ قریب سے دیکھنے پر اس کی ناک کا صحیح نقشہ معلوم ہو سکتا تھا۔ مگر دور سے دیکھنے پر وہ بالکل چپٹی معلوم ہوتی تھی کیونکہ جیسا کہ میں اس سے پیشتر بیان کر چکا ہوں۔ اس کے چہرے کے خطوط بالکل ہی مدھم تھے۔

اس کا قد عام لوگوں جتنا تھا۔ یعنی نہ چھوٹا نہ بڑا۔ البتہ جب وہ ایک خاص انداز سے یعنی اپنی کمر کی ہڈی کو ڈھیلا چھوڑ کے کھڑا ہوتا تو اس کے قد میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا۔ اس طرح جب وہ ایک دم کھڑا ہوتا تو اس کا قد جسم کے مقابلے میں بہت بڑا دکھائی دیتا۔

کپڑے اس کے خستہ حالت میں تھے۔ لیکن میلے نہیں تھے کوٹ کی آستینوں کے آخری حصے کثرت استعمال کے باعث گھس گئے تھے اور پھوسڑے نکل آئے تھے۔ کالر کھلا تھا اور قمیص بس ایک اور دھلائی کی مار تھی مگر ان کپڑوں میں بھی وہ خود کو ایک باوقار انداز میں پیش کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ میں بھی سعی کر رہا تھا۔ اس لیئے کہا۔ کیونکہ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے سارے وجود میں بے چینی کی لہر سی دوڑ گئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے آپ کو میری نگاہوں سے اوجھل رکھنا چاہتا ہے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور سگریٹ سلگا کر اس کی طرف پھر ڈبیا بڑھا دی۔ شوق فرمایئے

یہ میں نے کچھ اس طریقے سے کہا اور فوراً ہی ماچس سُلگا کر اس انداز سے پیش کی کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس نے ڈبیا میں سے سگریٹ نکال کر منہ میں دبایا اور اسے سُلگا کر پینا بھی شروع کر دیا۔ لیکن ایکا ایکی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور منہ میں سے سگریٹ نکال کر مصنوعی کھانسی کے آثار حلق میں پیدا کرتے ہوئے اس نے کہا: "کیونڈر مجھے راس نہیں آتے۔ ان کا تمباکو بہت تیز ہے۔ میرے گلے میں فوراً خراشیں پیدا ہو جاتی ہیں"۔

میں نے اس سے پوچھا: "آپ کون سے سگریٹ پسند کرتے ہیں۔؟"

اس نے تتلا کر جواب دیا: "میں...... میں...... میں دراصل سگریٹ بہت کم پیتا ہوں۔ کیونکہ ڈاکٹر اروالکر نے منع کر رکھا ہے۔ ویسے میں تھری کاسل پیتا ہوں جن کا تمباکو تیز نہیں ہوتا"۔

اس نے جس ڈاکٹر کا نام لیا۔ وہ بمبئی کا بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس کی فیس دس روپے ہے۔ جن سگرٹوں کا اس نے حوالہ دیا۔ اس کے متعلق آپ کو معلوم ہو گا کہ بہت مہنگے داموں پر ملتے ہیں۔ اس نے ایک ہی سانس میں دو جھوٹ بولے جو مجھے ہضم نہ ہوئے مگر میں خاموش رہا۔ حالانکہ سچ عرض کرتا ہوں۔ اس وقت میرے دل میں یہی خواہش چٹکیاں لے رہی تھی کہ اس کا غلاف اتار دوں اور اس کی دروغ گوئی کو بے نقاب کر دوں اور اسے کچھ اس طرح شرمندہ کروں کہ وہ مجھ سے معافی مانگے مگر میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس فیصلے پر پہنچا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا جزو بن کر رہ گیا ہے۔ جھوٹ بول کر چہرے پر جو ایک سُرخی سی دوڑ جایا کرتی ہے۔ مجھے نظر نہ آئی۔ بلکہ میں نے یہ دیکھا کہ وہ جو کچھ کہہ چکا ہے۔ اس کو حقیقت سمجھتا ہے۔ اس کے جھوٹ میں اس قدر اخلاص تھا۔ یعنی اس نے اتنے پر خلوص طریقے پر جھوٹ بولا تھا۔ کہ اس کی میزانِ احساس میں ہلکی سی جنبش بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ خیر اس قصّے کو چھوڑیئے ایسی باریکیاں میں آپ کو بتانے لگوں تو صفحوں کے صفحے کالے ہو جائیں گے۔ اور افسانہ بہت خشک ہو جائے گا۔

تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد میں نے اس کو راہ پر لگایا اور ایک اور سگریٹ پیش کر کے سمندر کے دلفریب منظر کی بات چھیڑ دی۔ چونکہ افسانہ نگار ہوں۔ اس لئے کچھ اس دلچسپ طریقے پر اسے سمندر، اپولو بندر اور وہاں آنے جانے والے تماشائیوں کے بارے میں چند باتیں سنائیں کہ چھ سگریٹ پینے پر بھی اس کے حلق میں خرخراہٹ پیدا نہ ہوئی۔ اس نے میرا نام پوچھا میں نے بتایا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا "آپ...... آپ مسٹر...... ہیں...... میں آپ کے کئی افسانے پڑھ چکا ہوں۔ مجھے...... مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہی...... ہیں...... مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ واللہ بہت خوشی ہوئی ہے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہا مگر اس نے اپنی بات شروع کر دی...... "ہاں خوب یاد آیا۔ ابھی حال ہی میں آپ کا ایک افسانہ میں نے پڑھا ہے...... عنوان بھول گیا ہوں...... اس میں آپ نے ایک لڑکی پیش کی ہے جو کسی مرد سے محبت کرتی تھی مگر وہ اسے دھوکا دے گیا۔ اسی لڑکی سے ایک اور مرد بھی محبت کرتا تھا جو افسانہ سناتا ہے۔ جب اس لڑکی کی اُفتاد کا پتہ چلتا ہے تو وہ اس سے ملتا ہے اور اس سے کہتا ہے۔ "زندہ رہو...... ان چند گھڑیوں کی یاد میں اپنی زندگی کی بنیادیں کھڑی کر دو جو تم نے اس کی مُحبّت میں گزاری ہیں اس مسرت کی یاد میں جیو جو تم نے چند لمحات کے لئے حاصل کی تھی۔ مجھے اصل عبارت یاد نہیں رہی لیکن مجھے بتلایئے۔ کیا ایسا ممکن ہے...... ممکن کو چھوڑیئے، آپ یہ بتایئے کہ وہ آدمی کیا آپ تو نہیں تھے؟...... معاف کیجئے گا۔ میں ایسے سوال کر رہا ہوں جو مجھے نہیں کرنے چاہئیں...... مگر کیا آپ ہی نے اس سے کوٹھے پر مُلاقات کی تھی اور اس کی تھکی ہوئی جوانی کو اونگھتی ہوئی چاندنی میں چھوڑ کر نیچے اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلے آئے تھے......" یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم ٹھہر گیا۔ مگر مجھے ایسی باتیں نہیں پوچھنی چاہئیں...... اپنے دل کا حال کون بتاتا ہے۔"

اس پر میں نے کہا۔ "میں آپ کو بتاؤں گا...... لیکن پہلی مُلاقات میں سب کچھ پوچھ لینا اور سب کچھ بتانا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" وہ جوش جو گفتگو کرتے

وقت اس کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا: "آپ کا فرمانا بالکل درست ہے مگر کیا پتہ ہے کہ آپ سے پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔"

اس پر میں نے کہا: "اس میں شک نہیں۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لیکن ہماری ایک نہیں بہت سی ملاقاتیں ہو سکتی ہیں۔ بیکار آدمی ہوں یعنی افسانہ نگار۔ . . . شام کو ہر روز اسی وقت بشرطیکہ بیمار نہ ہو جاؤں۔ آپ مجھے ہمیشہ اسی جگہ پر پائیں گے۔ . . . . یہاں بے شمار لڑکیاں سیر کو آتی ہیں اور میں اس لئے آتا ہوں کہ خود کو کسی کی محبت میں گرفتار کر سکوں۔ . . . محبت بری چیز نہیں ہے!"

"محبت۔ . . . محبت . . . . !" اس نے اس سے آگے کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا اور جلتی ہوئی رسی کی طرح آخری بل کھا کر خاموش ہو گیا۔

میں نے ازراہِ مذاق اس سے محبت کا ذکر کیا تھا۔ دراصل فضا اس وقت ایسی دلفریب تھی کہ اگر میں کسی عورت پر عاشق ہو جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ جب دونوں وقت آپس میں مل رہے ہوں۔ نیم تاریکی میں بجلی کے قمقمے قطار کے اندر آنکھیں جھپکنا شروع کر دیں۔ ہوا میں خنکی پیدا ہو جائے اور فضا پر ایک افسانوی کیفیت سی چھا جائے تو کسی اجنبی عورت کی قربت کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے۔ ایک ایسی ضرورت جس کا احساس تحتِ شعور ہی میں چھپا رہتا ہے۔

خدا معلوم اس نے کس افسانے کے متعلق مجھ سے پوچھا تھا۔ مجھے اپنے سب افسانے یاد نہیں اور خاص طور پر وہ تو بالکل یاد نہیں جو رومانی ہیں۔ میں اپنی زندگی میں بہت کم عورتوں سے ملا ہوں۔ وہ افسانے جو میں نے عورتوں کے متعلق لکھے ہیں یا تو کسی خاص ضرورت کے ماتحت لکھے ہیں یا محض دماغی عیاشی کے لئے۔ میرے ایسے افسانوں میں چونکہ خلوص نہیں ہے۔ اس لئے میں نے کبھی ان کے متعلق غور نہیں کیا۔ ایک خاص طبقے کی عورتیں میری نظر سے گذری ہیں اور ان کے متعلق میں نے چند افسانے لکھے ہیں، مگر وہ رومان نہیں ہیں۔ اس نے جس

افسانے کا ذکر کیا تھا۔ وہ یقیناً کوئی ادنےٰ درجے کا رومان تھا، جو میں نے اپنے چند جذبات کی پیاس بجھانے کے لئے لکھا ہوگا۔ ...... لیکن میں نے تو اپنا افسانہ بیان کرنا شروع کر دیا ہاں، تو جب وہ محبت کہہ کر خاموش ہو گیا تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ محبت کے بارے میں کچھ اور کہوں۔ چنانچہ میں نے کہنا شروع کیا۔ محبت کی یوں تو بہت سی قسمیں ہمارے باپ دادا بیان کر گئے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ محبت خواہ ملتان میں پیدا ہو یا سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں، سردیوں میں پیدا ہو، یا گرمیوں میں، امیر کے دل میں پیدا ہو یا غریب کے دل میں ...... محبت خوب صورت کریں یا بدصورت، بدکردار کرے یا نیکوکار ... محبت محبت ہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ جس طرح بچے پیدا ہونے کی صورت ہمیشہ ایک سی چلی آرہی ہے۔ اسی طرح محبت کی پیدائش بھی ایک ہی طریقے پر ہوتی ہے۔ یہ جُدا بات ہے کہ سعیدہ بیگم ہسپتال میں بچہ جنے اور راجکماری جنگل میں غلام محمد کے دل میں بھنگن محبت پیدا کر دے اور نتھو رلال کے دل میں کوئی رانی جس طرح بعض بچے وقت سے پہلے پیدا ہوتے ہیں اور کمزور رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ محبت بھی کمزور رہتی ہے جو وقت سے پہلے جنم لے بعض دفعہ بچے بڑی تکلیف سے پیدا ہوتے ہیں بعض دفعہ محبت بھی بڑی تکلیف دے کر پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح عورت کا حمل گر جاتا ہے۔ اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے۔ بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اِدھر بھی آپ کو ایسے آدمی نظر آئیں گے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہیں ...... اس کا یہ مطلب نہیں کہ محبت کرنے کی خواہش ان کے دِل سے ہمیشہ کے لئے مٹ جاتی ہے یا ان کے اندر وہ جذبہ ہی نہیں رہتا۔ نہیں، یہ خواہش ان کے دِل میں موجود ہوتی ہے، مگر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ محبت کر سکیں۔ جس طرح عورت اپنے جسمانی نقائص کے باعث بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ اسی طرح یہ لوگ چند رُوحانی نقائص کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے ...... محبت کا اسقاط بھی ہو سکتا ہے ......"

مجھے اپنی گفتگو دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں اس طرف دیکھے بغیر لیکچر دیئے چلا جا رہا تھا۔ لیکن جب میں اس کی طرف متوجہ ہُوا تو وہ دُور سمندر کے اس پار خلاء میں دیکھ رہا تھا اور اپنے خیالات میں گم تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔

جب زور سے کسی موٹر کا ہارن بجا تو وہ چونکا اور خالی الذہن ہو کر کہنے لگا "جی ..... آپ نے بالکل درست فرمایا!"

میرے جی میں آئی کہ اس سے پُوچھوں..... "درست فرمایا ہے؟..... اس کو چھوڑیئے۔ آپ یہ بتا دیجئے کہ میں نے کہا کیا ہے؟" لیکن میں خاموش رہا اور اس کو موقع دیا کہ اپنے وزنی خیالات دماغ سے جھٹک دے۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے بعد اس نے پھر کہا "آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے لیکن..... خیر چھوڑیئے اس قصّے کو۔"

مجھے اپنی گفتگو بہت اچھی معلوم ہُوئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی میری باتیں سُنتا چلا جائے۔ چنانچہ میں نے پھر سے کہنا شروع کیا "تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بعض آدمی بھی محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں یعنی ان کے دل میں محبت کرنے کی خواہش تو موجُود ہوتی ہے۔ لیکن ان کی یہ خواہش کبھی پُوری نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہُوں کہ اس بانجھ پن کا باعث روحانی نقائص ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس کا رنگ اور بھی زرد پڑ گیا۔ جیسے اس نے کوئی بھُوت دیکھ لیا ہو۔ یہ تبدیلی اس کے اندر اتنی جلدی پیدا ہُوئی کہ میں نے گھبرا کر اس سے پوچھا "خیریت تو ہے..... آپ بیمار ہیں؟"

"نہیں تو..... نہیں تو....." اس کی پریشانی اور بھی زیادہ ہو گئی..... "مجھے کوئی بیماری ومیاری نہیں ہے..... لیکن آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں بیمار ہُوں؟"

میں نے جواب دیا "اس وقت آپ کو جو کوئی بھی دیکھے گا یہی کہے گا کہ آپ بہت

بیمار ہیں۔ آپ کا رنگ خوفناک طور پر زرد ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے آپ کو گھر چلے جانا چاہیئے۔ آئیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

نہیں میں خود چلا جاؤں گا مگر میں بیمار نہیں ہوں۔۔۔۔۔ کبھی کبھی میرے دل میں معمولی سا درد پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ شاید وہی ہو۔۔۔۔۔ میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ آپ اپنی گفتگو جاری رکھیئے۔"

میں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ کیونکہ وہ ایسی حالت میں نہیں تھا کہ میری بات غور سے سن سکتا۔ لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے کہنا شروع کیا: "میں آپ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ ان لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جو محبت کرنے کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ میں ایسے آدمیوں کے جذبات اور ان کی اندرونی کیفیات کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن جب میں اس بانجھ عورت کا تصور کرتا ہوں جو صرف ایک بیٹی یا بیٹا حاصل کرنے کے لیئے دعائیں مانگتی ہے۔ خدا کے حضور میں گڑگڑاتی ہے۔ اور جب وہاں سے کچھ نہیں ملتا ٹونے ٹوٹکوں میں اپنا گوہر مقصود ڈھونڈتی ہے۔ شمشانوں سے راکھ لاتی ہے کئی کئی راتیں جاگ کر سادھوؤں کے بتلائے ہوئے منتر پڑھتی ہے منتیں مانتی ہے۔ چڑھاوے چڑھاتی ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ اس آدمی کی بھی یہی حالت ہوتی ہوگی۔ جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہو۔۔۔ ایسے لوگ واقعی ہمدردی کے قابل ہیں مجھے اندھوں پر اتنا رحم نہیں آتا جتنا ان لوگوں پر آتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ تھوک نگل کر دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا اور پرلی طرف منہ کر کے کہنے لگا: "اوہ بہت دیر ہوگئی۔ مجھے ضروری کام کے لیئے جانا تھا۔ یہاں باتوں باتوں میں کتنا وقت گذر گیا۔"

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پلٹا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر لیکن میری طرف دیکھے بغیر اس نے "اب رخصت چاہتا ہوں" کہا اور چل دیا۔

دوسری مرتبہ اس سے میری ملاقات پھر اپولو بندر ہی پر ہوئی میں سیر کا عادی نہیں ہوں مگر اس زمانے میں ہر شام اپولو بندر پر جانا میرا دستور ہو گیا تھا۔ ایک مہینے کے بعد جب مجھے آگرہ کے ایک شاعر نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس میں اس نے نہایت ہی حریصانہ طور پر اپالو بندر اور وہاں جمع ہونے والی پریوں کا ذکر کیا اور مجھے اس لحاظ سے بہت خوش قسمت کہا کہ میں بمبئی میں ہوں تو اپولو بندر سے میری دلچسپی ہمیشہ کے لیے فنا ہو گئی۔ اب جب کبھی کوئی مجھے اپولو بندر جانے کو کہتا ہے تو مجھے آگرے کے شاعر کا خط یاد آجاتا ہے اور میری طبیعت متلا جاتی ہے۔ لیکن میں اس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں۔ جب یہ خط مجھے نہیں ملا تھا۔ اور میں ہر روز جا کر شام کو اپولو بندر کے اس بنچ پر بیٹھا کرتا تھا جس کے اس طرف کئی آدمی چمپی والوں سے اپنی کھوپڑیوں کی مرمت کراتے رہتے ہیں۔

دن پوری طرح ڈھل چکا تھا اور اُجالے کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا۔ اکتوبر کی گرمی میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ہوا چل رہی تھی۔ ... تھکے ہوئے مسافر کی طرح سیر کرنے والوں کا ہجوم زیادہ تھا۔ میرے پیچھے موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ بنچ بھی سب کے سب پُر تھے۔ جہاں بیٹھا تھا۔ وہاں دو باتونی، ایک گجراتی اور ایک پارسی نہ جانے کب سے جمے ہوئے تھے دونوں گجراتی بولتے تھے مگر مختلف لب ولہجہ سے پارسی کی آواز میں دو سُر تھے وہ کبھی باریک سُر میں بات کرتا تھا۔ کبھی موٹے سُر میں۔ جب دونوں تیزی سے بولنا شروع کر دیتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے طوطے مینا کی لڑائی ہو رہی ہے۔

میں ان کی لا متناہی گفتگو سے تنگ آکر اُٹھا اور ٹہلنے کی خاطر تاج محل ہوٹل کا رُخ کرنے ہی لگا تھا کہ سامنے سے مجھے وہ آتا دکھائی دیا۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ اس لیے میں اسے پکار نہ سکا۔ لیکن جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کی نگاہیں ساکن ہو گئیں، جیسے اسے وہ چیز مل گئی ہو۔ جس کی اُسے تلاش تھی۔

کوئی بنچ خالی نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کہا۔ "آپ سے بہت دیر کے بعد

ملاقات ہُوئی ...... چلیے سامنے ریستوران میں بیٹھتے ہیں۔ یہاں کوئی بینچ خالی نہیں:"

اس نے رسمی طور پر چند باتیں کیں اور ساتھ ہو گیا۔ چند گزوں کا فاصلہ طے کرنے پر ہم دونوں ریستوران میں بید کی بڑی بڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چائے کا آرڈر دے کر میں نے اس کی طرف سگرٹوں کا ٹن بڑھا دیا۔ اتفاق کی بات ہے میں نے اسی روز دس رُوپے دے کر ڈاکٹر ارولکر سے مشورہ دیا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اوّل تو سگریٹ پینا ہی موقوف کر دو اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اچھے سگریٹ پیا کرو۔ مثال کے طور پر پانچ سو پچپن ...... چنانچہ میں نے ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق یہ ٹن اسی شام خریدا تھا۔ اس نے ڈبے کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر میری طرف نگاہیں اُٹھائیں، کچھ کہنا چاہا مگر خاموش ہو گیا۔

میں ہنس پڑا: "آپ نہ یہ سمجھئے گا کہ میں نے آپ کے کہنے پر یہ سگریٹ پینا شروع کیے ہیں ...... اتفاق کی بات ہے کہ آج مجھے بھی ڈاکٹر ارولکر کے پاس جانا پڑا۔ کیونکہ کچھ دنوں سے میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ سگریٹ پیا کرو لیکن بہت کم ......"

میں نے یہ کہتے ہُوئے اس کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کو میری یہ باتیں ناگوار معلوم ہُوئی ہیں۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنی جیب سے وہ نسخہ نکالا جو ڈاکٹر ارولکر نے مجھے لکھ دیا تھا۔ یہ کاغذ میز پر میں نے اس کے سامنے رکھ دیا: "یہ عبارت مجھ سے پڑھی تو نہیں جاتی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے وٹامن کا سارا خاندان اس نسخے میں جمع کر دیا ہے:"

اس کاغذ کو جس پر اُبھرے ہُوئے کالے حروف میں ڈاکٹر ارولکر کا نام اور پتہ مندرج تھا اور تاریخ بھی لکھی ہُوئی تھی۔ اس نے چور نگاہوں سے دیکھا اور وہ اضطراب جو اس کے چہرے پر پیدا ہو گیا تھا۔ فوراً دُور ہو گیا۔ چنانچہ اس نے مُسکرا کر کہا۔

"کیا وجہ ہے کہ اکثر لکھنے والوں کے اندر وٹامنز ختم ہو جاتی ہیں؟"

میں نے جواب دیا: "اس لیے کہ اُنہیں کھانے کو کافی نہیں ملتا۔ کام زیادہ کرتے ہیں

لیکن اُجرت بہت ہی کم ملتی ہے۔"

اس کے بعد چائے آ گئی اور دُوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

پہلی ملاقات اور اس مُلاقات میں غالباً ڈھائی مہینے کا فاصلہ تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ پہلے سے زیادہ پیلا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پیدا ہو رہے تھے۔ اسے غالباً کوئی رُوحانی تکلیف تھی جس کا احساس اسے ہر وقت رہتا تھا۔ کیُونکہ باتیں کرتے کرتے وہ بعض اوقات ٹھہر جاتا اور اس سے ہونٹوں سے غیرارادی طور پر آہ نکل جاتی۔ اگر ہنسنے کی کوشش بھی کرتا تو اس کے ہونٹوں میں زندگی پیدا نہیں ہوتی تھی۔

میں نے یہ کیفیت دیکھ کر اس سے اچانک طور پر پُوچھا" آپ اداس کیوں ہیں؟"

" اداس ...... اداس" ایک پھیکی سی مُسکراہٹ جو ان مرنے والوں کے لبوں پر پیدا ہُوا کرتی ہے جو ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ وہ موت سے خائف نہیں۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی۔

" میں اداس نہیں ہُوں۔ آپ کی طبیعت اداس ہو گی ——

اچھا تو میں اجازت چاہتا ہُوں ...... ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

مُجھے یقین تھا کہ اسے کسی ضروری کام سے نہیں جانا ہے۔ مگر میں نے اسے نہ روکا اور جانے دیا۔ اس دفعہ پھر اس کا نام دریافت نہ کر سکا۔ لیکن اتنا پتہ چل گیا کہ وہ ذہنی اور رُوحانی طور پر بے حد پریشان تھا۔ وہ اداس تھا بلکہ یُوں کہیئے کہ اداسی اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی۔ مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اُداسی کا دُوسروں کو علم ہو۔ وہ دو زندگیاں بسر کرنا چاہتا تھا۔ ایک وہ جو حقیقت تھی اور ایک وہ جس کی تخلیق میں وہ ہر گھڑی، ہر لمحہ مصروف رہتا تھا۔ لیکن اس کی زندگی کے یہ دونوں پہلو ناکام تھے۔ کیوُں؟ ...... یہ مُجھے معلوم نہیں۔

اس سے تیسری مرتبہ میری ملاقات پھر اپولو بندر پر ہُوئی۔ اس دفعہ میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں ہماری کوئی بات چیت نہیں ہُوئی۔ لیکن گھر پر اس کے ساتھ بہت سی باتیں ہُوئیں۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہُوا تو اس کے چہرے پر چند لمحات کے لیے

اُداسی چھاگئی مگر وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور اس نے اپنی عادت کے خلاف اپنے آپ کو بہت ترو تازہ اور باتونی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے اس پر اور بھی ترس آیا۔ وہ ایک موت جیسی یقینی حقیقت کو جھٹلا رہا تھا اور مزا یہ ہے کہ اس خود فریبی سے کبھی کبھی وہ مطمئن بھی نظر آتا تھا۔

باتوں کے دوران میں اس کی نظر میرے میز پر پڑی شیشے کے فریم میں اس کو ایک لڑکی کی تصویر نظر آئی۔ اُٹھ کر اس نے تصویر کی طرف جاتے ہوئے کہا "کیا میں آپ کی اجازت سے یہ تصویر دیکھ سکتا ہوں"۔

میں نے کہا "بصد شوق"۔

اس نے تصویر کو ایک نظر دیکھا اور دیکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا "اچھی خوبصورت لڑکی ہے.... میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی......"

"جی نہیں..... ایک زمانہ ہوا۔ اس سے محبت کرنے کا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا بلکہ یوں کہیے کہ تھوڑی سی محبت میرے دل میں پیدا ہو بھی گئی تھی مگر افسوس ہے کہ اس کو اس کی خبر تک نہ ہوئی اور میں...... میں..... نہیں بلکہ وہ بیاہ دی گئی..... یہ تصویر میری پہلی محبت کی یادگار ہے جو اچھی طرح پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئی ——"

"یہ آپ کی محبت کی یادگار ہے —— اس کے بعد تو آپ نے اور بہت سے رومان بھی لڑائے ہوں گے"۔ اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "یعنی..... یعنی آپ کی زندگی میں تو کئی ایسی نامکمل اور مکمل محبتیں موجود ہوں گی"۔

میں کہنے ہی والا تھا کہ جی نہیں خاکسار بھی محبت کے معاملے میں آپ جیسا ہی بنجر ہے۔ مگر جانے کیوں، یہ کہتا کہتا رُک گیا اور خواہ مخواہ جھوٹ بول دیا "جی ہاں..... ایسے سلسلے ہوتے ہی رہتے ہیں —— آپ کی کتابِ زندگی بھی تو ایسے واقعات سے بھرپور ہو گی"۔

وہ کچھ نہ بولا اور بالکل خاموش ہو گیا جیسے کسی گہرے سمندر میں غوطہ لگا گیا ہے۔ دیر

تک جب وہ اپنے خیالات میں غرق رہا اور میں اُس کی خاموشی سے اداس ہونے لگا تو میں نے کہا "اجی حضرت! آپ کن خیالات میں کھو گئے؟"

وہ چونک پڑا "میں.... میں..... کچھ نہیں، میں ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا۔"

میں نے پُوچھا "کوئی بیتی ہُوئی کہانی یاد آ گئی — کوئی بچھڑا ہُوا سپنا مل گیا..... پُرانے زخم ہرے ہو گئے۔"

"زخم..... پُرانے..... کئی زخم تو نہیں..... صرف ایک ہی ہے۔ بہت گہرا، بہت کاری..... اور زخم میں چاہتا بھی نہیں۔ ایک ہی زخم کافی ہے۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور میرے کمرے میں ٹہلنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیونکہ اُس چھوٹی سی جگہ میں جہاں کُرسیاں، میز اور چارپائی سب کچھ پڑا تھا۔ ٹہلنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میز کے پاس اسے رُکنا پڑا۔ تصویر کو اب کی دفعہ گہری نظروں سے دیکھا اور کہا "اس میں اور اس میں کتنی مشابہت ہے..... مگر اُس کے چہرے پر ایسی شوخی نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں بڑی تھیں مگر اُن آنکھوں کی طرح ان میں شرارت نہیں تھی۔ وہ فکرمند آنکھیں تھیں۔ ایسی آنکھیں جو دیکھتی بھی ہیں اور سمجھتی بھی ہیں"..... یہ کہتے ہُوئے اس نے ایک سرد آہ بھری اور کُرسی پر بیٹھ گیا "موت بالکل ناقابلِ فہم چیز ہے۔ خاص طور پر اُس وقت جب کہ یہ جوانی میں آئے..... میں سمجھتا ہُوں کہ خُدا کے علاوہ ایک اور طاقت بھی ہے جو بڑی حاسد ہے۔ جو کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی..... مگر چھوڑیئے اس قصے کو۔"

میں نے اُس سے کہا "نہیں نہیں، آپ سناتے جائیے..... لیکن اگر آپ ایسا مناسب سمجھیں..... سچ پُوچھئے تو میں یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ نے کبھی مُحبت کی ہی نہ ہوگی۔"

"یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے کبھی محبت کی ہی نہیں اور ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ میری کتابِ زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہوگی۔" یہ کہہ کر اُس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا "میں نے اگر محبت نہیں کی تو یہ دُکھ میرے دل میں کہاں سے

پیدا ہو گیا ہے؟ —— میں نے اگر محبت نہیں کی تو میری زندگی کو یہ روگ کہاں سے چمٹ گیا ہے؟ —— میں اُداس کیوں رہتا ہوں —— مجھے اپنے آپ کا ہوش کیوں نہیں ہے؟ ...... میں روز بروز موم کی طرح کیوں پگھلایا جا رہا ہوں؟"

بظاہر یہ تمام سوال وہ مجھ سے کر رہا تھا مگر در اصل وہ سب کچھ اپنے آپ ہی سے پوچھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "میں نے جھوٹ بولا تھا کہ آپ کی زندگی میں ایسے کئی واقعات ہوں گے مگر آپ نے بھی تو جھوٹ بولا تھا کہ میں اُداس نہیں ہوں اور مجھے کوئی روگ نہیں ہے ...... کسی کے دل کا حال جاننا آسان بات نہیں ہے۔ آپ کی اُداسی کی اور بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں مگر جب تک مجھے آپ خود نہ بتائیں۔ میں کسی نتیجے پر کیسے پہنچ سکتا ہوں ...... اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ واقعی روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو یقیناً بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے اور ...... اور ...... مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔"

"ہمدردی ......" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "مجھے کسی کی ہمدردی ضرورت نہیں۔ اس لیئے کہ ہمدردی اُسے واپس نہیں لا سکتی ...... اُس عورت کو موت کی گہرائیوں سے نکال کر میرے حوالے نہیں کر سکتی۔ جس سے مجھے پیار تھا ...... آپ نے محبت نہیں کی ...... مجھے یقین ہے۔ آپ نے محبت نہیں کی۔ اس لیئے کہ اس کی ناکامی نے آپ پر کوئی داغ نہیں چھوڑا —— میری طرف دیکھئے" یہ کہہ کر اس نے خود اپنے آپ کو دکھایا۔ "کوئی جگہ آپ کو ایسی نہیں ملے گی۔ جہاں میری محبت کے نقش موجود نہ ہوں ...... میرا وجود خود اس محبت کی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ملبہ ہے ...... میں آپ کو یہ داستان کیسے سناؤں اور کیوں سناؤں جب کہ آپ اُسے سمجھ ہی نہیں سکیں گے ...... کسی کا یہ کہہ دینا کہ میری ماں مر گئی ہے۔ آپ کے دل پر وہ اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ جو موت نے بیٹے پر کیا تھا ...... میری داستانِ محبت آپ کو ...... کسی کو بھی بالکل معمولی معلوم ہوگی۔ مگر مجھ پر جو اثر ہوا ہے۔ اس سے

کوئی بھی آگاہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ محبت میں نے کی ہے اور سب کچھ صرف مجھی پر گذرا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اُس کے حلق میں تلخی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ بار بار تھوک نگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا وہ آپ کو دھوکا دے گئی" میں نے اس سے پُوچھا "یا کچھ اور حالات تھے"؟

"دھوکا...... وہ دھوکا دے ہی نہیں سکتی تھی۔ خُدا کے لئے دھوکا نہ کہئے۔ وہ عورت نہیں فرشتہ تھی۔ مگر بُرا ہو اس موت کا جو ہمیں خوش نہ دیکھ سکی اور اسے ہمیشہ کے لئے اپنے پروں میں سمیٹ کرلے گئی..... آہ!...... آپ نے میرے دل پر خراشیں پیدا کر دی ہیں۔ سُنئے..... سُنئے، میں آپ کو اس دردناک داستان کا کچھ حصہ سناتا ہُوں ...... وہ ایک بڑے اور امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ جس زمانے میں اُس کی اور میری پہلی مُلاقات ہُوئی۔ میں اپنے باپ دادا کی ساری جائداد عیاشیوں میں برباد کر چکا تھا۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ اپنا وطن چھوڑ کر لکھنؤ چلا آیا۔ اپنی موٹر چونکہ میرے پاس ہُوا کرتی تھی۔ اس لئے میں صرف موٹر چلانے کا کام جانتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کو اپنا پیشہ قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ پہلی ملازمت مجھے ڈپٹی صاحب کے یہاں ملی۔ جن کی وہ اکلوتی لڑکی تھی......"

یہ کہتے کہتے وہ اپنے خیالات میں کھو گیا اور دفعتاً چُپ ہو گیا۔ میں بھی خاموش رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ چونکا اور کہنے لگا "میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"آپ ڈپٹی صاحب کے ملازم ہو گئے"۔

ہاں، وہ انہی ڈپٹی صاحب کی اکلوتی لڑکی تھی۔ ہر روز صبح نو بجے میں زہرہ کو موٹر میں سکول لے جایا کرتا تھا۔ وہ پردہ کرتی تھی مگر موٹر ڈرائیور سے کوئی کب تک چھپ سکتا ہے۔ میں نے اُسے دوسرے روز ہی دیکھ لیا...... وُہ صرف خوبصورت ہی نہیں تھی بلکہ اس میں ایک خاص بات بھی تھی...... بڑی سنجیدہ اور متین لڑکی تھی۔ اُس کی سیدھی مانگ نے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار پیدا کر دیا تھا۔ وُہ..... وُہ..... میں کیا عرض

کروں وہ کیا تھی۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اُس کی صورت اور سیرت بیان کرسکوں۔۔۔۔"

بہت دیر تک وہ اپنی زہرہ کی خوبیاں بیان کرتا رہا۔ اس دوران میں اُس نے کئی مرتبہ اُس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات اُس کے دماغ میں ضرورت سے زیادہ جمع ہو گئے ہیں۔ کبھی کبھی بات کرتے کرتے اس کا چہرہ تمتما اُٹھتا۔ لیکن پھر اُداسی چھا جاتی اور وہ آہوں میں گفتگو کرنا شروع کر دیتا۔ وہ اپنی داستان بہت آہستہ آہستہ سُنا رہا تھا۔ جیسے خود بھی مزا لے رہا ہو۔ ایک ایک ٹکڑا جوڑ کر اُس نے اپنی ساری کہانی پُوری کی۔ جس کا ماحصل یہ تھا۔

زہرہ سے اُسے بے پناہ محبت ہو گئی۔ کچھ دن موقع پا کر اس کا دیدار کرنے اور طرح طرح کے منصُوبے باندھنے میں گزر گئے۔ مگر جب اُس نے سنجیدگی سے اس محبت پر غور کیا تو خود کو زہرہ سے بہت دُور پایا۔ ایک موٹر ڈرائیور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کیسے کرسکتا ہے؟ چنانچہ جب اس تلخ حقیقت کا احساس اُس کے دل میں پیدا ہُوا۔ تو وہ مغموم رہنے لگا۔ لیکن ایک روز اُس نے بڑی جُرأت سے کام لیا۔ کاغذ کے ایک پُرزے پر اُس نے زہرہ کو چند سطریں لکھیں۔۔۔۔۔۔ یہ سطریں مجھے یاد ہیں۔

"زہرہ! اچھی طرح جانتا ہُوں کہ تمہارا نوکر ہُوں۔ تمہارے والد صاحب مجھے تیس رُوپے ماہوار دیتے ہیں۔ مگر میں تم سے محبت کرتا ہُوں ـــــ میں کیا کروں، کیا نہ کروں، میری سمجھ میں نہیں آتا ـــــ"

یہ سطریں کاغذ پر لکھ کر اس نے کاغذ اس کی کتاب میں رکھ دیا۔ دُوسرے روز جب وہ اُسے موٹر میں اسکول لے گیا تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ہینڈل کئی بار اُس کی گرفت سے نکل نکل گیا۔ مگر خُدا کا شُکر ہے کہ کوئی ایکسیڈنٹ نہ ہُوا۔ اس روز کی کیفیت عجیب رہی شام کو جب وہ زہرہ کو اسکول سے واپس لا رہا تھا تو راستے میں اُس لڑکی نے موٹر رُکنے کے لئے کہا۔ اس نے جب موٹر روک لی تو زہرہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ دیکھو نعیم

آئندہ تم ایسی حرکت کبھی نہ کرنا۔ میں نے ابھی تک اباجی سے تمہارے اُس خط کا ذکر نہیں کیا جو تُم نے میری کتاب میں رکھ دیا تھا۔ لیکن اگر پھر تم نے ایسی حرکت کی تو مجبوراً ان سے شکایت کرنا پڑے گی سمجھے..... چلو اب موٹر چلاؤ۔"

اس گفتگو کے بعد اُس نے بہت کوشش کی کہ ڈپٹی صاحب کی نوکری چھوڑ دے اور زہرہ کی محبت کو اپنے دل سے ہمیشہ کے لئے مٹا دے۔ مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک مہینہ اسی کش مکش میں گذر گیا۔ ایک روز اُس نے پھر جرأت سے کام لے کر خط لکھا اور زہرہ کی ایک کتاب میں رکھ کر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ دُوسرے روز صُبح کو اُسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ شام کو سکول سے واپس آتے ہوئے زہرہ اس سے ہمکلام ہوئی اور ایک بار پھر اُس کو ایسی حرکتوں سے باز رہنے کے لئے کہا "اگر تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں تو کم از کم میری عزت کا تو کچھ خیال تمہیں ہونا چاہیئے۔" یہ اس نے ایک بار پھر اُسے کچھُ اس سنجیدگی اور متانت سے کہا کہ نعیم کی ساری اُمیدیں فنا ہو گئیں اور اُس نے قصد کر لیا کہ وہ نوکری چھوڑ دے گا اور لکھنؤ سے ہمیشہ کے لئے چلا جائے گا۔ مہینے کے اخیر میں نوکری چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنی کوٹھڑی میں لالٹین کی مدھم روشنی میں زہرہ کو آخری خط لکھا۔ اس میں اُس نے نہایت درد بھرے لہجے میں اس سے کہا "زہرہ! میں نے بہت کوشش کی کہ میں تمہارے کہے پر عمل کر سکوں مگر دل پر میرا اختیار نہیں ہے۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ کل شام کو میں لکھنؤ چھوڑ دوں گا اس لئے تمہیں اپنے والد صاحب سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری خاموشی میری قسمت کا فیصلہ کر دے گی۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ تم سے دُور رہ کر تم سے محبت نہیں کروں گا۔ میں جہاں کہیں بھی رہوں گا۔ میرا دل تمہارے قدموں میں ہو گا...... میں ہمیشہ اُن دنوں کو یاد کرتا رہوں گا۔ جب میں موٹر اس لئے آہستہ آہستہ چلاتا تھا کہ تمہیں دھکا نہ لگے...... میں اس کے سوا اور تمہارے لئے کر ہی کیا سکتا تھا..."

یہ خط بھی اُس نے موقع پاکر اُس کی کتاب میں رکھ دیا۔ صُبح کو زہرہ نے اسکول جاتے ہُوئے اُس سے کوئی بات نہ کی اور شام کو بھی راستے میں اُس نے کچھ نہ کہا۔ چنانچہ وہ بالکل نا امید ہوکر اپنی کوٹھڑی میں چلا آیا۔ جو تھوڑا بہت اسباب اُس کے پاس تھا باندھ کر اس نے ایک طرف رکھ دیا۔ اور لالٹین کی اندھی روشنی میں چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ زہرہ اور اُس کے درمیان کتنا بڑا فاصلہ ہے۔

وہ بے حد مغموم تھا۔ اپنی پوزیشن سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک ادنیٰ درجے کا ملازم ہے اور اپنے آقا کی لڑکی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی سوچتا تھا کہ اگر وہ اس سے محبت کرتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے اور پھر اس کی محبت فریب تو نہیں۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ آدھی رات کے قریب اُس کی کوٹھڑی کے دروازے پر دستک ہُوئی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن پھر اُس نے خیال کیا۔ کہ مالی ہوگا۔ ممکن ہے۔ اُس کے گھر میں کوئی ایکا ایکی بیمار پڑ گیا ہو اور وہ اُس سے مدد لینے کے لیے آیا ہو۔ لیکن جب اُس نے دروازہ کھولا تو زہرہ سامنے کھڑی تھی — جی ہاں زہرہ...... دسمبر کی سردی میں شال کے بغیر وُہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اُس کی زبان گنگ ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کہے۔ چند لمحات قبر کی سی خاموشی میں گذر گئے۔ آخر زہرہ کے ہونٹ وا ہُوئے اور تھرتھراتے ہُوئے لہجے میں اُس نے کہا: "نعیم میں تمہارے پاس آگئی ہُوں۔ بتاؤ اب تم کیا چاہتے ہو.... لیکن اس سے پہلے کہ تمہاری اس کوٹھڑی میں داخل ہوں۔ میں تم سے چند سوال کرنا چاہتی ہُوں"

نعیم خاموش رہا۔ لیکن زہرہ اس سے پُوچھنے لگی: "کیا واقعی تم مُجھ سے مُحبت کرتے ہو؟"

نعیم کو جیسے ٹھیس سی لگی۔ اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ "زہرہ تم نے ایسا سوال کیا ہے جس کا جواب اگر میں دوں تو میری محبت کی توہین ہوگی..... میں تم سے پُوچھتا ہُوں، کیا میں محبت نہیں کرتا؟"۔

زہرہ نے اس سوال کا جواب نہ دیا اور تھوڑی دیر خاموش رہ کر اپنا دوسرا سوال" کیا میرے باپ کے پاس کافی دولت ہے، مگر میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ جو کچھ میرا کہا جاتا ہے میرا نہیں، ان کا ہے۔ کیا تم مجھے دولت کے بغیر بھی ویسا ہی عزیز سمجھو گے؟

نعیم بہت جذباتی آدمی تھا۔ چنانچہ اس سوال نے بھی اُس کے وقار کو زخمی کیا۔ بڑے دُکھ بھرے لہجے میں اُس نے زہرہ سے کہا۔ زہرہ خُدا کے لئے مجھ سے ایسی باتیں نہ پُوچھو یہ — جواب اس قدر عام ہو چکا ہے کہ تمہیں تھرڈ کلاس عشقیہ ناولوں میں بھی مل سکتا ہے ......"

زہرہ اس کی کوٹھڑی میں داخل ہو گئی اور اُس کی چارپائی پر بیٹھ کر کہنے لگی " میں تمہاری ہُوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی"

زہرہ نے اپنا قول پُورا کیا۔ جب دونوں لکھنؤ چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور شادی کر کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے تو ڈپٹی صاحب ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے نعیم کو نوکری مل گئی تھی۔ اس لئے وہ گھر میں نہیں تھا۔ ڈپٹی صاحب نے زہرہ کو بہت بُرا بھلا کہا۔ اُن کی ساری عزت خاک میں مل گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ زہرہ نعیم کو چھوڑ دے اور جو کچھ ہو چکا ہے۔ اُسے بھول جائے۔ وہ نعیم کو دو ہزار رُوپے دینے کے لئے بھی تیار تھے مگر اُنہیں ناکام لوٹنا پڑا۔ اس لئے کہ زہرہ نعیم کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہُوئی۔ اس نے اپنے باپ سے کہا " اباجی! میں نعیم کے ساتھ بہت خوش ہُوں۔ آپ اُس سے اچھا شوہر میرے لئے کبھی تلاش نہ کر سکتے۔ میں اور وہ آپ سے کچھ نہیں مانگتے۔ اگر آپ ہمیں دُعائیں دے سکیں تو ہم آپ کے ممنون ہوں گے"

ڈپٹی صاحب نے جب یہ گفتگو سُنی تو بہت خشم آلود ہُوئے۔ اُنہوں نے نعیم کو قید کرا دینے کی دھمکی بھی دی۔ مگر زہرہ نے صاف صاف کہہ دیا " اباجی! اس میں نعیم کا کیا قصور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں بے قصور ہیں۔ البتہ ہم ایک دُوسرے سے محبت ضرور کرتے ہیں اور وہ میرا شوہر ہے...... یہ کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نابالغ نہیں ہُوں"

ڈپٹی صاحب عقلمند تھے، فوراً سمجھ گئے کہ جب اُن کی بیٹی ہی رضامند ہے تو نعیم پر کیسے جُرم عائد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ زہرہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد ڈپٹی صاحب نے مختلف لوگوں کے ذریعے سے نعیم پر دباؤ ڈالنے اور اس کو روپے پیسے سے لالچ دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

دونوں کی زندگی بڑے مزے میں گذر رہی تھی گو نعیم کی آمدن بہت ہی کم تھی اور زہرہ کو جو نازونعمت میں پلی تھی۔ بدن پر کھُردرے کپڑے پہننے پڑتے تھے اور اپنے ہاتھ سے سب کام کرنے پڑتے تھے۔ مگر وہ خوش تھی اور خود کو ایک نئی دُنیا میں پاتی تھی۔ جہاں قدم قدم پر نعیم کی محبت کے نئے نئے پہلو اُس پر منکشف ہوتے تھے۔ وہ بہت سُکھی تھی ـــــ بہت سُکھی۔ نعیم بہت خُوش تھا۔ لیکن ایک روز خُدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ زہرہ کے سینے میں ایک موذی درد اُٹھا اور پیشتر اس کے کہ نعیم اُس کے لئے کچھ کر سکے۔ وہ اس دُنیا سے رخصت ہو گئی۔ اور نعیم کی دُنیا ہمیشہ کے لئے تاریک کر گئی۔

یہ داستان اُس نے رُک رُک کر اور خود مزے لے لے کر قریباً چار گھنٹوں میں سنائی۔ جب وہ اپنا حالِ دل سُنا چکا تو اس کا چہرہ بجائے زرد ہونے کے تمتما اُٹھا جیسے اس کے اندر آہستہ آہستہ کسی نے خُون داخل کر دیا ہے۔ لیکن اُس کی آنکھوں میں آنسُو تھے اور اس کا حلق سُوکھ گیا تھا۔

داستان جب ختم ہو گئی تو وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہُوا، جیسے اُسے بہت جلدی ہے اور کہنے لگا۔

"میں نے بہت غلطی کی...... جو آپ کو اپنی داستانِ محبت سنا دی...... میں نے بہت غلطی کی...... زہرہ کا ذکر صرف مجھی تک محدود رہنا چاہیئے تھا...... لیکن...... لیکن......"

اس کی آواز بھرّا گئی......" میں زندہ ہُوں اور وہ...... وہ......" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور جلدی سے میرا ہاتھ دبا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

نعیم سے پھر میری مُلاقات نہ ہُوئی۔ اپولو بندر پر کئی مرتبہ اُس کی تلاش میں گیا مگر وہ نہ مِلا۔ چھ یا سات مہینے کے بعد اُس کا ایک خط مجھے ملا جو میں یہاں پر نقل کر رہا ہُوں۔

صاحب!

آپ کو یاد ہو گا میں نے آپ کے مکان پر اپنی داستانِ عشق سنائی تھی ـــــ وہ محض فسانہ تھا۔ ایک جھُوٹا افسانہ۔ ایک جھُوٹا افسانہ، نہ کوئی زہرہ ہے نہ نعیم ..... میں ویسے موجُود تو ہُوں مگر وہ نعیم نہیں ہُوں جس نے زہرہ سے مُحبّت کی تھی۔ آپ نے ایک بار کہا تھا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو محبت کے معاملے میں بانجھ ہوتے ہیں۔ میں بھی اُن بدقسمت آدمیوں میں سے ایک ہُوں۔ جس کی ساری جوانی اپنا دل پرچانے میں گذر گئی۔ زہرہ سے نعیم کی محبت ایک دل بہلاوا تھا اور زہرہ کی موت...... میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ میں نے اُسے کیوں مار دیا۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں بھی میری زندگی کی سیاہی کا دخل ہو۔

مجھے معلُوم نہیں۔ آپ نے میرے افسانے کو جھُوٹا سمجھا یا سچا۔ لیکن میں آپ کو ایک عجیب وغریب بات بتاتا ہُوں کہ میں نے..... یعنی اس جھُوٹے فسانے کے خالق نے اس کو بالکل سچا سمجھا۔ سو فیصد حقیقت پر مبنی۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ میں نے واقعی زہرہ سے مُحبّت کی ہے اور وہ سچ مچ مر چکی ہے۔ آپ کو یہ سُن کر اور بھی تعجب ہو گا کہ جُوں جُوں وقت گذرتا گیا۔ اس فسانے کے اندر حقیقت کا عنصر زیادہ ہوتا گیا۔ اور زہرہ کی آواز، اُس کی ہنسی بھی میرے کانوں میں گونجنے لگی۔ میں اُس کے سانس کی گرمی تک محسوس کرنے لگا۔ افسانے کا ہر ذرہ جاندار ہو گیا اور میں نے...... اور میں نے یُوں اپنی قبر اپنے ہاتھوں سے کھود ی۔

زہرہ فسانہ نہ سہی مگر میں تو فسانہ ہُوں۔ وہ مر چکی ہے۔ اس لِئے مجھے بھی مر جانا چاہیئے یہ خط آپ کو میری موت کے بعد ملے گا...... الوداع..... زہرہ مجھے ضرور ملے گی..... کہاں؟..... مجھے معلُوم نہیں۔

میں نے یہ چند سطور صرف اس لِئے آپ کو لکھ دی ہیں کہ آپ افسانہ نگار ہیں۔ اگر اس سے آپ افسانہ تیار کریں تو آپ کو سات آٹھ رُوپے مل جائیں گے۔ کیونکہ ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ افسانے کا معاوضہ آپ کو سات سے دس رُوپے تک مِل جایا کرتا ہے۔ یہ

میرا تحفہ ہوگا۔ اچھا الوداع!"

آپ کا مُلاقاتی "نعیم"

نعیم نے اپنے لیے زہرہ بنائی اور مرگیا —— میں نے اپنے لیے یہ افسانہ تخلیق کیا ہے اور زندہ ہُوں —— یہ میری زیادتی ہے۔

('منٹو کے افسانے' سے)

"منٹو زندہ تھا تو عوام کو اُمید تھی کہ جب بھی کہیں کوئی
ناانصافی ہوگی، منٹو کے نوٹس میں آجائے گی، اور پھر وہ سماج
کو، عوام کو، حکومت کو مجبور کرے گا، کہ اِس حقیقت کے
گھناؤنے گوشے کو کم از کم جھانک کر دیکھ لے۔"

بلقیس عابد علی (گلِ خنداں، منٹو نمبر)

ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ ابھی ابھی اُس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چُور، گھر کو واپس گیا تھا ——— وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت خیال تھا جو اُس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ رُوپے جو اُس نے اپنی جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کئے تھے اُس کی چُست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اُوپر کو اُبھرے ہوئے تھے کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکّے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اُس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکّوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خُون میں ٹپک رہی ہے!

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی کچھ تو اس برانڈی کے باعث تھی۔ جس کا ادّھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اُس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے مُنہ لیٹی تھی۔ اُس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ جو اوس میں بھیگ جانے

کے باعث پتلے کاغذ سے جُدا ہو جائے ــــــــ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت اُبھرا ہُوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ جیسے نچی ہُوئی مُرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہُوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے۔ جن کے اُوپر مُنہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا۔ اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا مُنہ چڑا رہا تھا۔ اس کُتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اُڑے ہُوئے تھے، دُور سے اگر کوئی اس کُتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سُرخی ہونٹوں کی سُرخ بتی، پاؤڈر کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ غالباً اپنے جُوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا، پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہُوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہُوا تھا، ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اُڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کُرسی پڑی تھی جس کی پُشت سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کُرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی۔ ہز ماسٹر وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہُوئے کالے کپڑے کی بہت بُری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہُوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اُوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے۔ جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر، یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں گنیش جی کی شوخ رنگ تصویر تھی۔ جو تازہ اور سُوکھے ہُوئے پھُولوں سے لدی ہُوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اُتار کر فریم میں جڑوائی گئی تھی۔ اس

تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر جو کہ چکنا ہو رہا تھا، تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لیئے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا۔ جس کی کو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کے مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دُھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں جب وہ بوہنی کرتی تھی تو دُور سے گنیش جی کی اس مورتی سے رُوپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر اُنھیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی اُبھری ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ جتنے روپے بھی اپنی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے، البتہ کبھی کبھی مادھو پُونے سے چھٹی لیکر آتا تو اُسے اپنے کچھ رُوپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے رُوپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سُنا کہ مادھو پونے سے آکر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا —"اس سالے کو تُو نے کب سے یار بنایا ہے؟ —— یہ بڑی انوکھی عاشقی معشوقی ہے! —— سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے —— سوگندھی مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے —— سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہُوں تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہُوں۔"

یہ کہہ کر رام لال دلّال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصّوں سے دس رُوپے سے لے کر سو رُوپے تک ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا سوگندھی کو بتلایا —"سالی اپنا دھن یُوں نہ برباد کر —— تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اُتار کرلے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار! —— اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر، اور جب وہ یار آیا کرے تو اُس سے کہا کر —— تیری جان کی قسم مادھو صُبح سے ایک دھیلے کا مُنہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا بُھوک سے میرے پیٹ میں چُوہے دوڑ رہے ہیں —— سمجھیں؟ بہت نازک وقت آگیا ہے میری جان —— اس سالی کانگرس

نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل جاتی ہے بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جُون میں چلا جاؤں"۔

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اُس سے کہا تھا۔ "نیچے سے اِن بمب کے گولوں کو باندھ کے رکھا کر انگیا پہنا کرے گی تو ان کی سختائی ٹھیک رہے گی"۔

سوگندھی یہ سُن کر ہنس دی۔ "جمنا تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تُو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا ——— کوئی مُوا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ ——— ارے ہاں کل کی بات تجھے سناؤں۔ رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس رُوپے طے ہُوا ——— جب سونے لگے تو میں نے بتی بُجھا دی ——— ارے وہ تو ڈرنے لگا! ——— سُنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کِرکِرا ہو گیا! ——— وہ ڈر گیا! میں نے کہا، چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں، ابھی دن چڑھ آئے گا ——— بولا ——— روشنی کرو ——— میں نے کہا، یہ روشنی کیا ہُوا ——— بولا لائٹ ——— لائٹ! ——— اُس کی بھنچی ہُوئی آواز سُن کر مجھ سے ہنسی نہ رُکی۔ "بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی! ——— اور یہ کہہ کر میں نے اُس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی ——— تڑپ کر اُٹھ بیٹھا اور لائٹ اون کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی، اور کہا، تجھے شرم نہیں آتی مردوے"! ——— وہ پلنگ پر آیا تو میں اُٹھی اور لپک کر لائٹ بُجھا دی! ——— وہ پھر گھبرانے لگا ——— تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی کبھی اندھیرا! کبھی اُجالا، کبھی اُجالا، کبھی اندھیرا ——— ٹرام کی کھڑکھڑ ہُوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اُٹھ بھاگا ——— سالے نے تیس رُوپے سٹّے میں جیتے ہوں گے جو یُوں مفت دے گیا ——— جمنا، تو بالکل الھڑ ہے، بڑے بڑے گُر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لیے"!

سوگندھی کو واقعی بہت سے گُر یاد تھے جو اُس نے اپنی ایک دو سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گُر سب کو بتایا کرتی تھی ——— "اگر آدمی شریف ہو، زیادہ باتیں نہ کرنے والا ہو، تو اُس سے خُوب شرارتیں کرو، اَن گنت باتیں کرو، اُسے چھیڑو، ستاؤ، اس کے گدگدی کرو، اُس سے کھیلو ——— اگر داڑھی رکھتا ہو تو اُس میں اُنگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ ——— اُس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مُطابق کچھ کرنے پائے ——— وہ خوش خوش چلا جائے گا اور تُم بھی بچی رہو گی ——— ایسے مرد جو گُپ چُپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن ——— ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے"!

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی کہ خُود کو ظاہر کرتی تھی۔ اُس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گُر جو اُسے یاد تھے۔ اُس کے دماغ سے پھسل کر اُس کے پیٹ میں آجاتے تھے۔ جس پر ایک بچہ پیدا کرنے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں! ——— ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اُسے ایسا لگا تھا کہ اُس کے خارش زدہ کُتّے نے اپنے پنجے سے یہ نشان بنا دیئے ہیں ——— جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اُس کے پالتو کتّے کے پاس سے گزر جاتی تھی تو وہ شرمندگی دُور کرنے کے لئے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی۔ لیکن جُونہی کوئی نرم و نازک بات ——— کوئی کومل بول ——— اُس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دُوسرے حصّوں میں پھیل جاتی گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اُس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضا سب کے سب اُس کے بہت بُری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے ——— ایسی تھکن جو اُنھیں جھنجھوڑ کر ——— اُنھیں مار کر سُلانے پر مجبُور کر دے! ایسی نیند جو تھک کر چُور چُور ہونے کے بعد آئے، کتنی مزیدار ہوتی ہے ——— وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے، کتنا آنند دیتی ہے! ——— کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور

کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ تُم نہیں ہو! اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تُم ہوا میں بہت اُونچی جگہ لٹکی ہُوئی ہو۔ اُوپر ہَوا، نیچے ہَوا، دائیں ہَوا۔ بس ہَوا ہی ہَوا! اور پھر اس ہَوا میں دم گھُٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی اور اپنی ماں کا صندوق کھول کر اُس میں چھُپ جایا کرتی تھی، تو ناکافی ہَوا میں دم گھُٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی کتنا مزا دیا کرتی تھی!

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھُپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اُس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی اِن کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے! یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی، آنکھ مچولی ہی تو تھی — کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اُسے ڈھونڈ لیتا تھا — بس یُونہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ اس کو خُوش رہنا پڑتا تھا ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوانی پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے لیے بے شمار گُر یاد تھے۔ اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ اُن مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور اُن کے ساتھ بڑے رُوکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی۔ ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہ جایا کرتی تھی۔ اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی! —

ہر روز رات کو اس کا پُرانا یا نیا ملاقاتی اُس سے کہا کرتا تھا۔ "سوگندھی، میں تجھ سے پریم کرتا ہُوں۔" اور سوگندھی یہ جان بُوجھ کر کہ وہ جھُوٹ بولتا ہے۔ بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اُس سے پریم کیا جا رہا ہے — پریم — کتنا سُندر بول ہے! وہ چاہتی تھی، اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مَل لے، اُس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اُس کے مساموں میں رچ جائے — یا پھر وہ خُود اُس کے اندر چلی جائے سمٹ سمٹا کر اُس کے اندر داخل ہو جائے اور اُوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے

اور پریم کئے جانے کا جذبہ اُس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اُس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہُوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شرُوع کر دے اور لوریاں دے کر اُسے اپنی گود ہی میں سلا دے!

پریم کر سکنے کی اہلیت اُس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اُس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ مُحبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی۔ جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اُس کے دل میں موجُود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے۔ لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوُں نہیں ہوتا۔ یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی —— ایک بار آئینہ دیکھتے ہوُئے بے اختیار اُس کے مُنہ سے نکل گیا تھا —— "سوگندھی —— تجُھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!"

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور اُن کی راتیں، اُس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اُس کو خُوشی نصیب نہیں ہُوئی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں موجُود تھی۔ تاہم وہ چاہتی تھی کہ یُونہی اُس کے دن بیتتے چلے جائیں، اُسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو رُوپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس رُوپے اس کا عام نرخ تھا۔ جس میں سے ڈھائی رُوپے رام لال اپنی دلالی کے کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات رُوپے اسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اُس کی اکیلی جان کے لئے کافی تھے اور مادھو جب پُونے سے بقول رام لال دلال، سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لیے آتا تھا۔ تو وہ دس پندرہ رُوپے خراج بھی ادا کرتی تھی! یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اُس سے کچُھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال نے ٹھیک کہا تھا اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے! بتا ہی کیوں نہ دیں! —— سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہُوئی تو اُس نے کہا تھا۔ "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے! جانتی ہے تو میرے ساتھ کس بات کا سودا کر رہی ہے؟ —— اور میں تیرے پاس کیوُں آیا ہُوں؟ —— چھی چھی چھی —— دس رُوپے، اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی

رُوپے دلّال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نا ساڑھے سات ؟ ــــــ اب ان ساڑھے سات روپیوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہُوں جو میں لے ہی نہیں سکتا ــــ مجھے عورت چاہیئے پر تجھے کیا اس وقت ، اسی گھڑی مرد چاہیئے ؟ ــــ مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی پر کیا میں تجھے جچتا ہُوں ! ــــ تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں ــــ بس یہ دس روپے ، جن میں سے ڈھائی دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے ، تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں ــــ تو بھی ان کا بجنا سُن رہی ہے اور میں بھی ۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور ــــ کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری ــــ پُونے میں حوالدار ہُوں ۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا تین چار دن کے لئے ــــ یہ دھندا چھوڑ ــــ میں تجھے خرچ دیا کروں گا ــــ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا ــــ ؟

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا ۔ جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہُوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی ۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہُوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں ، بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا ــــ سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا ــــ اور پانی کا یہ گھڑا ــــ دیکھنا ۔ کتنا میلا ہے اور یہ ــــ یہ چیتھڑے ــــ یہ چندیاں ــــ اُف کتنی بُری باس آتی ہے ، اُٹھا کے باہر پھینک ان کو ــــ اور تُو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے ــــ اور ــــ اور ــــ تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو دونوں آپس میں گھُل مل گئے تھے اور سوگندھی کو تو ایسا محسوس ہُوا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے ۔ اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں ، میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا ۔ اور نہ کبھی کسی نے اُس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اُس کا ایک گھر ہے ۔ جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے ۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک

کی غلاظت کو محسوس کئے بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا "دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہو رہی ہے کہیں زکام نہ ہو جائے تجھے ——— ٹھہر میں تیرے واسطے دوا لاتا ہُوں"۔ مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سُنائی تھیں اُس نے سوگندھی کو ——— اسے محسوس ہونے لگا کہ اُسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان دونوں سے سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پُونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہُوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا "دیکھ سوگندھی! اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی ——— اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا ——— دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا ——— ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا......"

نہ مادھو نے کبھی پونہ سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے، کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا "تو یہ ٹر ٹر کیا کرتا ہے، ایک پھُوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تُو نے؟" اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پُوچھا تھا "یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں" ——— دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہُوئی زندگی بسر کر رہے تھے ——— لیکن سوگندھی خُوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کئے ہُوئے گہنوں پر راضی ہو جاتا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی۔ بجلی کا قمقمہ جسے اوف کرنا وہ بھُول گئی تھی۔ اس کے سر کے اُوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اُس کی مندی ہُوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہُوئی ——— رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا

گیا تو چونک کر اُٹھ بیٹھی ——— دو ملی جُلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے مُنہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیسدار تھا دھوتی کے پلو سے اُس نے بدبُودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے پلنگ کے نیچے دیکھا تو اس کا کُتا سوکھے ہوئے چپلوں پر مُنہ رکھے سو رہا تھا۔ اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا مُنہ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیئے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی سوگندھی بستر پر سے اُٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دُوسرا ڈونگا غٹا غٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا "رام لال؟"

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنّا کر کہنے لگا "تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو گیا تھا۔ ایک کلاک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کہاں مر گئی تھی؟" ——— پھر آواز دبا کر اُس نے ہولے سے کہا۔ اندر کوئی ہے تو نہیں؟"

جب سوگندھی نے کہا "نہیں" ——— تو رام لال کی آواز پھر اُونچی ہو گئی "تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ ——— بھئی حد ہو گئی۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا ——— اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے جھٹ پٹ یہ دھوتی اُتار کر وہ پھُولوں والی ساڑھی پہن، پوڈر لگا اور چل میرے ساتھ ——— باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں ——— چل چل ایک دم جلدی کر۔"

سوگندھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اُٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا "رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔"

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مُڑ کر کہا "تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔"

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دُور کر دی۔"وہ بات نہیں رام لال! ——— ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں —— بہت پی گئی۔"

رام لال کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔"تھوڑی بچی ہو تو لا ——— ذرا ہم بھی مُنہ کا مزا ٹھیک کریں۔"

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔"بچائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد کیوں ہوتا ——— دیکھ رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اُسے اندر ہی لے آؤ۔"

رام لال نے جواب دیا۔"نہیں بھئی وہ اندر نہیں آسکتے۔ جنٹلمین آدمی ہیں، وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے ——— تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کے نکڑ تک چل —— سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جب کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ کبھی قبول نہ کرتی۔ مگر اُسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی۔ جس کا خاوند موٹر کے نیچے آکر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جواں لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا۔ اس لئے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی نے کل ہی اُس کو ڈھارس دی تھی اور اس سے کہا تھا۔ "بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پُونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اُس سے کچھ روپے لے کر تیرے جانے کا بندوبست کر دوں گی۔" مادھو پُونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا۔ چنانچہ وہ اُٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اُس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سُرخ پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک اور ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہولی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کھمبوں پر جڑے تھے پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث اُن کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر

نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ نظر آتا اور رات کے پچھلے پہر کی بھید وں بھری خاموشی ـــــ سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اُسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا۔ جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔ "لیجئے وہ آ گئی ـــــ بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کئے" ـــــ پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سوگندھی اِدھر آ سیٹھ جی بلاتے ہیں۔"

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی اُنگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ صاحب نے بیٹری اُس کے چہرے کے پاس روشن کی ایک لمحے کے لئے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے "اُونہہ" نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑپھڑایا اور کار یہ جا وہ جا......

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اُس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر کیا ہوا تھا۔ اس "اُونہہ" کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟.... کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی۔ "پسند نہیں کیا تجھے! ـــــ اچھا بھئی میں چلتا ہوں دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کئے۔"

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں، اُس کی باہنوں میں، اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوئی۔ کہاں ہے وہ موٹر ـــــ کہاں ہے وہ سیٹھ ـــــ تو "اونہہ" کا مطلب یہ تھا کہ اُس نے مجھے پسند نہیں کیا ـــــ اُس کی......

گالی اُس کے پیٹ کے اندر سے اُٹھی اور زبان کی نوک پر آ کر رُک گئی۔ وُہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اُس کی دُم کی سُرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈُوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لال لال انگارہ "اُونہہ" ہے جو اُس کے سینے میں برمے کی طرح اُترا چلا جا رہا ہے۔ اُس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے: "او سیٹھ ——— او سیٹھ ——— ذرا موٹر روکنا اپنی ——— بس ایک منٹ کے لئے۔" پر وہ سیٹھ تھڑی ہے اُس کی ذات پر، بہت دُور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھُولوں والی ساڑھی جو وُہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پہلے پہر کی ہلکی پھُلکی ہَوا سے لہرا رہی تھی یہ ساڑھی اور اس کی ریشمیں سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بُری معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھڑے اڑا دے۔ کیونکہ ساڑھی ہَوا میں لہرا لہرا کر "اُونہہ، اُونہہ" کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سُرخی۔ جب اُسے خیال آیا کہ یہ سنگار اُس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اُسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دُور کرنے کے لئے اس نے کیا کچھ نہ سوچا ——— "میں نے اس موئے کو دکھلانے کے لئے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا یہ تو میری عادت ——— میری کیا سب کی یہی عادت ہے ——— پر ——— پر ——— یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلّال اور ——— یہ بازار ——— اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک" ——— یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبّے اُس کی حدِّ نگاہ تک فضا میں اِدھر اُدھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ اُسے ہَوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اُس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہُوا۔ جب ہَوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اُسے ایسا لگا کہ سرد سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اُس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود

تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور اُن کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اُس کا انگ انگ دُکھنے لگے، اس کے سر میں درد ہو، اس کے پیٹ میں درد ہو، اُس کی باہنوں میں درد ہو ‘ —— ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہُوا —— کیا یہ درد تھا؟ —— ایک لمحے کے لیئے اُس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا —— یہ کیا تھا؟ ...... لعنت! یہ تو وہی ”اُونہہ“ تھی جو اُس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اُٹھے ہی تھے کہ رُک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلّال کا خیال ہے کہ اُسے میری شکل پسند نہیں آئی —— شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اُس نے یہ کہا تھا۔ ”سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا! اُسے —— اُسے —— صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی —— نہیں آئی تو کیا ہُوا؟ —— مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل پسند نہیں آئی —— وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا۔ کتنی بُری صورت تھی اُس کی —— کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا تو مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ —— کیا مجھے اُبکائی آتے آتے نہیں رُک گئی تھی؟ —— ٹھیک ہے، پر سوگندھی —— تو نے اُسے دھتکارا نہیں تھا، تو نے اس کو ٹھکرایا نہیں تھا —— اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے مُنہ پر تھوکا ہے —— اونہہ —— اس ”اونہہ“ کا اور مطلب ہی کیا ہے؟ —— یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل —— اُونہہ —— یہ مُنہ اور مسُور کی دال —— ارے رام لال تو چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے —— اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تُو —— دس رُوپے اور یہ عورت —— خچر کیا بُری ہے ......“

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اُس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر سر کی چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اُس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال دلّال پر جس نے رات کے دو

بجے اُسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پاکر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی اس کے آتے ہی اُس کی آنکھیں، اُس کے کان، اس کی باہیں، اس کی ٹانگیں، اُس کا سب کچھ مڑتا تھا کہ اُس سیٹھ کو کہیں دیکھ پاتے ——— اس کے اندر یہ خواہش شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو ——— صرف ایک بار........ وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے، موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے "اُونہہ" کی آواز آئے اور وہ ——— سوگندھی ——— اندھا دُھند اپنے دونوں ہاتھوں سے اُس کا مُنہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور ——— اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اُس نے موجودہ فیشن کے مطابق رکھے تھے اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے ——— بالوں سے پکڑ کر اُسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے ——— جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لیے آیا کہ اُس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے بڑے آنسو بن گئے تھے، ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا "تم روتی کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو" ——— آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک اُن آنسوؤں میں تیرتا رہا جو اب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اُس خلا کو گھورتی رہی۔ جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ ——— یہ آواز کہاں سے آئی؟ ——— سوگندھی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن کسی کو نہ پایا ——— ارے یہ تو اس کا دل پھڑپھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے اُس کا دل ——— یہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو! ——— آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے ——— اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رُک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا ——— بالکل اُس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ آ کے رُک جاتا تھا "رات کٹی گن گن تارے" کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہُوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا "کتنے سندر ہیں"۔

——— وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے پر جب اُس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اُس کے دماغ میں کُودا "یہ تارے سندر ہیں پر تُو کتنی بھونڈی ہے ——— کیا بھُول گئی کہ ابھی ابھی تیری صُورت کو پھٹکارا گیا ہے"؟

سوگندھی بد صُورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کرکے اُس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جو ان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ رُوپ اب وہ نہیں رہا تھا۔ جو آج سے پانچ سال پہلے تھا۔ جب کہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ لیکن وہ بد صُورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل و صُورت ان عام عورتوں کی سی تھی۔ جن کی طرف مرد گذرتے گذرتے گھور کے دیکھ لیا کرتے ہیں۔ اس میں وہ تمام خُوبیاں موجُود تھیں۔ جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اُس عورت میں ضروری سمجھتا ہے۔ جس کے ساتھ اُسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہوں۔ وہ جوان تھی۔ اُس کے اعضا متناسب تھے۔ کبھی کبھی نہاتے وقت جب اُس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خُود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران شاید کوئی آدمی اُس سے ناخوش ہو کر گیا ہو ——— بڑی ملنسار تھی، بڑی رحم دل تھی۔ پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی، ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اُٹھ کر جب اُس نے دُوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اُتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوہ لے اُڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہُوا۔ چھٹیاں گذارنے کے لئے حیدر آباد سے بمبئی آیا تھا، اب اُس کے پاس واپس جانے کے لئے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اُسے اُس کے دس رُوپے واپس دے دیئے تھے ——— "مُجھ میں کیا بُرائی ہے۔"؟ سوگندھی نے یہ سوال ہر اُس چیز سے کیا جو اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور سڑک کی اکھڑی ہُوئی بجری ———

ان سب چیزوں کی طرف اُس نے باری باری دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اُس کے اُوپر جُھکا ہُوا تھا۔ مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔

جواب اس کے اندر موجُود تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ بُری نہیں اچھی ہے۔ پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُس کی تائید کرے ـــــ کوئی ـــــ کوئی ـــــ کسی وقت کوئی اُس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف، اتنا کہہ دے "سوگندھی! کون کہتا ہے، تو بُری ہے، جو تجھے بُرا کہے۔ وہ آپ بُرا ہے" ـــــ نہیں۔ یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔ "سوگندھی تو بہت اچھی ہے"!

وہ سوچنے لگی وہ کیوں چاہتی ہے کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اُسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہ ہُوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے اُن پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں "ماں" بن رہا تھا ـــــ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شئے کو اپنی گود میں لینے کے لئے کیوں تیار ہو رہی تھی؟ ـــــ اُس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اُس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے ـــــ اپنے گرم گرم گال اور اُس کی ساری سردی چُوس لے۔

تھوڑی دیر کے لئے اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی ہمدردی کی نظروں سے اُسے دیکھ رہی ہے اور اُس کے اُوپر جُھکا ہُوا آسمان بھی مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اُس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے ـــــ لیکن اُس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی؟ ـــــ وہ کیوں اپنے اندر اُس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی۔ جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے ـــــ اُس کا جی چاہتا تھا کہ اُس کے جسم کا ہر مسام کُھل جائے، اور جو کچھ اس کے اندر

اُبل رہا ہے۔ اُن کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو ـــــ کیسے ہو؟

سوگندھی گلی کے نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بمبکے کے پاس کھڑی تھی ـــــ ہوا کے تیز جھونکے سے اس بمبکے کی آہنی زبان جو اُس کے کھلے ہوئے مُنہ میں لٹکتی رہتی ہے، لڑکھڑائی تو سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اُس طرف اُٹھیں جدھر موٹر گئی تھی مگر اُسے کچھ نظر نہ آیا ـــــ اُسے کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور ـــــ اور ـــــ نہ آئے ـــــ بلا سے ـــــ میں اپنی جان کیوں ہلکان کروں ـــــ گھر چلتے ہیں۔ اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردسری ہی تو ہے۔ ـــــ چل سوگندھی گھر چل ـــــ ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی، اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا ـــــ فسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ سیٹھ اور اس موٹر کی ایسی تیسی ـــــ"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے۔ جس طرح پُوجا کرنے کے بعد اُس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا۔ اُسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اُس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اُس کے دل میں اُٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا ـــــ قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بُلا کر، باہر بازار میں، مُنہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے اُس کی ابھی ابھی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اُس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کیے جیسے کوئی اُسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں ـــــ اُس سیٹھ نے ـــــ پرماتما کرے......

سوگندھی نے چاہا کہ اُس کو بد دُعا دے مگر سوچا، بد دُعا دینے سے کیا بنے گا مزا تو جب تھا

کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرّے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی ـــــ اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر بے چین رہتا ـــــ کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی "یہی لینے آیا تھا نا تو؟ ـــــ لے دام دیئے بنا لے جا اسے ـــــ پر جو کچھ میں ہوں، جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے۔ وہ تو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا ـــــ"

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آرہے تھے، اگر اُس سیٹھ سے ایک بار ـــــ صرف ایک بار ـــــ اُس کی مڈ بھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے۔ نہیں، نہیں یہ کرے۔ ـــــ یُوں اُس سے انتقام لے، نہیں یُوں نہیں، یُوں ـــــ لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اُس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو اُسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی ـــــ بس صرف ایک چھوٹی سی گالی، جو اُس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل پر اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔ چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم گئی۔ کنڈے میں تالا نہیں تھا! سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی، اندر سے کسی نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی اندر داخل ہو گئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا "آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا ـــــ صبح کی سیر تندرستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ اس طرح صبح اُٹھ کر گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سُستی دُور ہو جائے گی اور تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے ـــــ وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہو گی تو؟ ـــــ کیوں"؟

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کیا کرتا تھا تو اُس کا مطلب یہ نہیں ہوتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصّہ

لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصّہ لے
—— چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی، اس سے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جس کی پشت پر اُس کے تیل سے چپڑے ہُوئے سر نے میل کا
ایک بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی "میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی"۔
مادھو بڑا سٹپٹایا۔ "انتظار؟ —— تجھے آج کیسے معلوم ہُوا کہ میں آج آنے والا ہوں"۔
سوگندھی کے بھینچے ہُوئے لب کھلے۔ اُن پر ایک پیلی مُسکراہٹ نمودار ہُوئی۔ "میں نے رات
تجھے سپنے میں دیکھا تھا —— اُٹھی تو کوئی بھی نہ تھا۔ سوچی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں.....
..... اور......."

مادھو خوش ہو کر بولا۔ "اور میں آگیا —— بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں،
کسی نے ٹھیک کہا ہے، دل کو دل سے راہ ہے —— تُو نے سپنا کب دیکھا تھا؟"

سوگندھی نے جواب دیا۔ "چار بجے کے قریب"۔

مادھو کرسی پر سے اُٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔ "اور میں نے تجھے ٹھیک دو بجے سپنے
میں دیکھا —— جیسے تُو پھُولوں والی ساڑھی —— ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس
کھڑی ہے، تیرے ہاتھوں میں —— کیا تھا تیرے ہاتھوں میں! —— ہاں تیرے ہاتھوں
میں روپوں سے بھری ہُوئی تھیلی۔ تُو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا "مادھو، تُو
چنتا کیوں کرتا ہے؟ —— لے یہ تھیلی —— ارے تیرے میرے رُوپے کیا دو ہیں؟
—— سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اُٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رُخ کیا —— کیا سناؤں
بڑی پریشانی ہے! —— بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا۔ اب بیس تیس روپے ہوں تو
—— انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے چھٹکارا ملے —— تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے
پیر دبا دوں سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے —— ادھر میری طرف پیر

کر کے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں باہنوں کا تکیہ بنا کر وہ اُن پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ اور اس لہجے میں جو اُس کا اپنا نہیں تھا۔ مادھو سے کہنے لگی "مادھو، یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟ ——— جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے ——— بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ میں تھما دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے ——— جان بچی لاکھوں پائے ——— بس بس اب جانے دے، تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے ——— مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا ——— کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے ——— واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا "دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا ——— اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو...... زیادہ دینے کی ضرورت نہیں، میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس!" یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اترواتے وقت تصویر اُتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل نکل کر گویا پکار رہی تھی "ہمارا فوٹو اُترے گا!"

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اُترواتے وقت اُسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھکھلا کر ہنس پڑی ——— اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا "کس کی تصویر دیکھ کر

تو اس قدر زور سے ہنسی ہے"؟

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی تھی۔
"اس کی ـــــ منشی پالٹی کے اس داروغہ کی۔۔۔۔۔۔۔ دیکھ تو اس کا تھوبڑا ـــــ کہتا تھا ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی ـــــ اونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال"۔ یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی!

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ سوگندھی نے اس جھنکار کے ساتھ کہا۔ "رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی ساتھ لے جائے گی"۔
ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔

مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا۔ "ہی ہی ہی۔۔۔۔"

سوگندھی نے دوسرا فریم بھی نوچ لیا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ "اس سالے کا یہاں کیا مطلب ہے؟ ـــــ بھونڈی شکل کا کوئی آدمی یہاں نہیں رہے گا۔۔۔۔۔۔ کیوں مادھو؟"
مادھو پھر بڑی مشکل سے مسکرایا اور پھر ہنسا۔ "ہی ہی ہی۔۔۔۔"

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھایا جس میں مادھو کا فوٹو جڑا ہوا تھا۔ مادھو اپنی جگہ پر سمٹ گیا جیسے ہاتھ اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے "اونہہ" کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا۔ "اچھا کیا؟ ـــــ مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا"۔

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ "تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا —— پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے ایسی کونسی چیز جو کسی کو پسند آسکتی ہے —— یہ تیری پکوڑا ایسی ناک، یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا، یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے، یہ تیرے مڑے ہوئے کان، یہ تیرے منہ کی باس، یہ تیرے بدن کا میل؟ —— تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا، اونہہ...... پسند کیوں ہوتا، تیرے عیب جو چھپا رکھے تھے اس نے........ آج کل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہی برا ——"

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔ "دیکھ سوگندھی، مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر اپنا دھندا شروع کر دیا ہے —— اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں......"

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیلے سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا —— اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟"

مادھو چکرا گیا۔

سوگندھی نے کہنا شروع کیا۔ "میں بتاتی ہوں —— پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا —— اور دس روپیہ بھاڑا ہے میرا اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے، باقی رہے ساڑھے سات، رہے نہ ساڑھے سات؟ ان ساڑھے سات روپیوں میں وہ چیز دینے کا وچن دیا تھا۔ جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا —— تیرا میرا ناتا ہی کیا تھا۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے، سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری ضرورت ہوئی اور مجھے تیری پہلے تیرے اور میرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے، آج پچاس بج رہے ہیں تو بھی ان کا بجنا

سُن رہا ہے اور میں بھی اُن کا بجنا سُن رہی ہُوں ـــــ میں نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے؟"
یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی اُنگلی سے ایک طرف اُڑا دی۔ یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اُس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا" سوگندھی!"
سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رُومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا" یہ چیتھڑے یہ چندیاں ـــــ اُف کتنی بُری باس ہے۔ اُٹھا کے باہر پھینک ان کو ۔۔۔۔۔"
مادھو چلّایا" سوگندھی!"
سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا" سوگندھی کے بچّے تو آیا کس لئے ہے یہاں؟ ـــــ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس رُوپے دے گی؟ یا کوئی ایسا بڑا گبرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہُوں ۔۔۔۔۔ کُتّے، کمینے، مجھ پر رُعب گانٹھتا ہے؟ میں تیری دبیل ہُوں کیا؟۔ بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟ ـــــ میں پُوچھتی ہُوں تُو ہے کون؟ ـــــ چور یا گٹھ کُترا؟ ـــــ اس وقت مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟ ـــــ بلاؤں پُلیس کو؟ ـــــ پُونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو، یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں ـــــ"
مادھو سہم گیا۔ دبے ہُوئے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا" سوگندھی، تجھے کیا ہو گیا ہے؟"
" تیری ماں کا سر ـــــ تُو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا ـــــ بھاگ یہاں سے، ورنہ ـــــ" سوگندھی بلند آواز سُن کر اُس کا خارش زدہ کُتّا جو سُوکھے ہُوئے چپلوں پر مُنہ رکھے سو رہا تھا، ہڑبڑا کر اُٹھا اور مادھو کی طرف مُنہ اُٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا کُتّے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔
مادھو ڈر گیا۔ گری ہُوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے وہ جُھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی" خبردار پڑی رہنے دے وہیں۔ تُو جا، تیرے پُونہ پہنچتے ہی میں اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔" یہ کہہ کر وُہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کُرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے خارش زدہ کُتّے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ سیڑھیاں اُتار کر جب کُتّا اپنی ٹُنڈ منڈ

دُم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر کان پھڑپھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی ——— اُس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سنّاٹا دیکھا ——— ایسا سنّاٹا جو اُس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے ——— جیسے مُسافروں سے لدی ہُوئی ریل گاڑی سب اسٹیشنوں پر مُسافروں کو اُتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے....

یہ خلاء جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔ اُسے بہت ستا رہا تھا۔ اُس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سُود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر چھلنی کا سا حساب تھا اِدھر دماغ کو پُر کرتی تھی۔ اُدھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

دیر تک وہ بید کی کُرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اُس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اُس نے اپنے خارش زدہ کُتّے کو گود میں اُٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اُسے پہلو میں لٹا کر سوگئی!۔

(منٹو کے افسانے' سے)

"مُسافر کو رستہ بھُولنا ہی تھا، اِس لیے کہ اس نے چلتے وقت
نقطۂ آغاز پر کوئی نِشان نہیں بنایا تھا، اپنے بنائے ہُوئے
دائرے کے خط کے ساتھ ساتھ گھُومتا، وہ یقیناً کئی بار ادھر
سے گُذرا، مگر اسے یاد نہ رہا کہ اس نے اپنا طویل سفر کہاں سے
شُروع کیا تھا اور میں سمجھتا ہُوں کہ میرا جی یہ بھُول گیا تھا کہ وُہ
مُسافر ہے، سفر ہے یا راستہ"

(گنجے فرشتے)

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی۔ جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی، ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک دن اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا۔ "دِس لیف ——— ویری بیڈ" یعنی یہ زندگی بہت بری ہے۔ جب کھانے ہی کو نہیں ملتا۔"

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کر لیا کرتی تھی۔ یہ گورے اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی۔ "صاحب ہماری سمجھ میں تمھاری بات نہیں آتا۔" اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے

کہتی "صاحب تم ایک دم اُلّو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ ــــــ سمجھا" یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی۔ بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی ــــــ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سُلطانہ کو بالکل اُلّو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی۔ ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔ تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہو گئے تھے۔ جہاں اس نے سُنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ جو گرمیوں میں شملے جاتے ہیں۔ صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔ صرف چھ، یعنی مہینے میں دو۔ اور ان چھ گاہکوں سے اس نے خُدا جھُوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ رُوپے وصول کئے تھے۔ تین رُوپے سے زیادہ پر کوئی مانتا ہی نہیں تھا۔ سُلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس رُوپے بتایا تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا "بھئی ہم تین روپے سے زیادہ ایک کوڑی نہیں دیں گے" جانے کیا بات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین رُوپے کے قابل سمجھا۔ چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خُود اس سے کہا "دیکھو میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک ادھیلا تُم کم کہو تو نہ ہو گا۔ اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ" چھٹے آدمی نے یہ بات سُن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔ جب دوسرے کمرے میں دروازے بند کر کے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سُلطانہ نے کہا "لائیے ایک رُوپیہ دُودھ کا" اس نے ایک رُوپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سُلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی چلو جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں ــــــ بیس رُوپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا۔ جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔ اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا۔ جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں

غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لئے پاخانے میں گئی تو اس کی کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔ فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔ اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لئے تیار کئے گئے ہیں یہ زنجیر اسی لئے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے۔ مگر یونہی اس نے زنجیر کو پکڑ کر اٹھنا چاہا۔ اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس زور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدابخش اپنے کمرے میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائیڈرو کونین ڈال رہا تھا۔ کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔ دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا "کیا ہوا؟ —— یہ چیخ تمہاری تھی"۔

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کہا "موا یہ پاخانہ ہے یا کیا ہے بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔ میری کمر میں درد تھا، میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکا ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں"۔

اس پر خدابخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے۔ جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدابخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے خدابخش راولپنڈی کا تھا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھی چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک عورت سے ہو گئی۔ اس کو بھگا کر وہ ساتھ لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لئے اس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ

جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خُدا بخش کو معلوم ہُوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں آیا۔ جہاں اس کو سُلطانہ مل گئی۔ سُلطانہ نے اس کو پسند کیا چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

خُدا بخش کے آنے سے ایک دم سُلطانہ کا کاروبار چمک اُٹھا، چونکہ عورت ضعیف الاعتقاد تھی۔ اس لئے اس نے سمجھا کہ خُدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خُدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خُدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس سے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھا پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لیکر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا۔ دو کُرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔

کام چل نکلا چنانچہ اس نے تھوڑی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد لوگوں سے واقفیت ہو گئی۔ چنانچہ وہ سُلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خُدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سُلطانہ کے مستقل گاہک بن گئے۔

سلطانہ نے کانوں کے لئے بندے خریدے، ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوائیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑھیاں بھی جمع کر لیں۔ گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی جانے خُدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سُلطانہ انکار کیسے کرتی جب کہ خُدا بخش کو اپنے لئے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خُوشی خُوشی دہلی جانا قبول کر لیا۔ بلکہ اُس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں۔ اس کا دھندا

اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سُن چکی تھی پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ بھی۔ جس سے اُسے بے حد عقیدت تھی۔ چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آگئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر یہ فلیٹ لیا۔ جس میں دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دکانیں تھیں اور اُوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی ہیں۔ اس لیے شروع شروع میں سُلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوئی تھی۔ پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی۔ "یہاں میلے کپڑوں کی دُھلائی کی جاتی ہے"۔ یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کر لیا کرتی تھی۔ اسی طرح اس نے اور بہت سی نِشانیاں قائم کر لی تھیں۔ مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں "کوئلوں کی دکان" لکھا تھا۔ وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی۔ جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں "شرفا کے لیے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے" لکھا تھا وہاں اس کی دُوسری سہیلی مختار رہتی تھی۔ نواڑ کے کارخانہ کے اُوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانے کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانے کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی۔ پر جب دو مہینے گذر گئے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا۔ تو اُسے بہت تشویش ہوئی۔ اس نے خُدا بخش سے کہا۔ "کیا بات ہے خُدا بخش۔ پُورے دو مہینے ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے، کسی نے ادھر کا رُخ بھی نہیں کیا ——— مانتی ہُوں آج کل بازار بہت مندا ہے۔ پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ

مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے"۔ خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصے سے کھٹک رہی تھی۔ مگر وہ خاموش تھا پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اُس نے کہا "میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہُوں۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دُوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گئے ہیں ـــــ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ......" وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس کی آواز کی طرف متوجہ ہُوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہُوئی۔ خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا ایک آدمی اندر داخل ہُوا۔ یہ پہلا گاہک تھا۔ جس سے تین رُوپے سودا طے ہُوا۔ اس کے بعد پانچ اور آئے۔ یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے ساڑھے اٹھارہ رُوپے وصُول کیے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے۔ پانی، ٹیکس اور بجلی کا بل جُدا، اس کے علاوہ گھر کے دُوسرے خرچ۔ کھانا، پینا، کپڑے لتے، دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ رُوپے تین مہینے میں آئے تو اُسے آمدن نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہو گئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا "تم میری سنو اور چلو واپس انبالے ـــــ یہاں کیا دھرا ہے؟ ـــــ بھئی ہو گا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہُوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ۔ میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہُوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔"

خُدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا "نہیں جانِ من! انبالے نہیں جائیں گے۔ یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دیگا۔"

سُلطانہ چُپ ہو رہی۔ چنانچہ آخری کنگنی بھی ہاتھ سے اُتر گئی۔ ننگے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دُکھ ہوتا تھا۔ پر کیا کرتی۔ پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گذر گئے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سُلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سُلطانہ کو اس کا بھی دُکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجُود تھیں۔ جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی۔ پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت بُرا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا دن وہ اپنے سنسان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی۔ کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکنی میں آکر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دُوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال واسباب کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھُلا میدان تھا۔ جس میں بے شمار ریل کی پٹڑیاں بچھی ہُوئی تھیں۔ دُھوپ میں لوہے کی یہ پٹڑیاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹڑیوں کی طرح اُبھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھُلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتیں۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی صبح سویرے جب وہ اُٹھ کر بالکنی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھندلکے میں انجنوں کے مُنہ سے گاڑھا گاڑھا دھُواں نکلتا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹڑیوں سے اُٹھتے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں

ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹڑیوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اُسے بھی کسی نے زندگی کی پٹڑی پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود چار ہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے ——— نہ جانے کہاں پھر ایک روز ایسا آئے گا۔ جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہوگا اور وہ کہیں رُک جائے گی کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا۔

یُوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹڑیوں اور ٹھہرے اور چلتے ہُوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی۔ پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اس اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا۔ مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ جو سامنے ریل کی پٹڑیوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دُھواں اُٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں۔ جن کو چند موٹے موٹے انجن اِدھر سے اُدھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سُلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے جو کبھی کبھی انبالہ میں اُس کے ہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گذرتا دیکھتی تو اُسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اُوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سُلطانہ سمجھتی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکنی میں جانا چھوڑ دیا۔ خُدا بخش سے اس نے بارہا کہا۔ "دیکھو میرے حال پہ رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔ میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہُوں"۔ مگر اس نے ہر بار سُلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی۔ "جانِ من میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہُوں۔ اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں بیڑا پار ہو جائے گا"۔

پُورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک سُلطانہ کا بیڑا پار ہُوا تھا نہ خدا بخش کا۔ محرم کا مہینہ سر پر آرہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ مختار نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لئے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑھی خریدی تھی۔ اُس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ ساڑھی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی۔ کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جُوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سُلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دُکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لئے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت اُداس تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خُدا بخش حسبِ معمُول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی پر جب اُس کی گردن اُونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو باہر بالکنی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹڑیوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا ۔۔۔۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا۔ اس لئے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گئے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چُپ چاپ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اُونچی کر کے سُلطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مُسکرا دی اور اس کو بھول گئی۔ کیونکہ اب سامنے پٹڑیوں پہ ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔ سُلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب و غریب خیال دماغ میں سے نکالنے کی خاطر

جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اُسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اُسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پُوچھا۔ کدھر سے آؤں۔ سلطانہ نے اسے راستہ بتا دیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا۔ مگر پھر بڑی پھُرتی سے اُوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اُسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اُس نے سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا "آپ اُوپر آتے ڈر کیوں رہے تھے"۔ وہ آدمی یہ سُن کر مسکرایا "تمھیں کیسے معلوم ہُوا ——— ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟ اس پر سلطانہ نے کہا "یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر سوچ کر ادھر آئے"۔ وہ یہ سُن کر پھر مسکرایا "تمھیں غلط فہمی ہُوئی۔ میں تمھارے اُوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکنی میں سبز بلب روشن ہُوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ سلطانہ نے پُوچھا "آپ جا رہے ہیں؟" اس آدمی نے جواب دیا "نہیں میں تمھارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہُوں ——— چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ"۔

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیئے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا "میرا نام شنکر ہے"۔

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل وصورت کا آدمی تھا مگر اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن

پر سے اُوپر کو اُٹھا ہُوا تھا۔

شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا۔ شنکر کے بجائے سُلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سُلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا۔

"فرمایئے......"

شنکر بیٹھا تھا یہ سُن کر لیٹ گیا۔" میں کیا فرماؤں کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تم نے ہے مجھے۔"

جب سُلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اُٹھ بیٹھا۔" میں سمجھا، لو اب مجھ سے سُنو، جو کچھ تم نے سمجھا غلط ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہُوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔"

سُلطانہ یہ سُن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔" آپ کام کیا کرتے ہیں؟"

شنکر نے جواب دیا۔" یہی جو تُم لوگ کرتے ہو۔"

"کیا؟"

"تُم کیا کرتی ہو؟"

"میں..... میں...... میں کُچھ بھی نہیں کرتی۔"

"میں بھی کچھ نہیں کرتا۔"

سُلطانہ نے بھنّا کر کہا۔" یہ تو کوئی بات نہ ہُوئی ــــــ آپ کُچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہوں گے۔"

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔" تُم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہو گی۔"

"جھک مارتی ہُوں۔"

"میں جھک مارتا ہُوں۔"

"تو آؤ دونوں جھک ماریں۔"

"حاضر ہُوں مگر جھک مارنے کے دام کبھی نہیں دیا کرتا۔"

" ہوش کی دوا کرو ـــــــ یہ لنگر خانہ نہیں۔"

" اور میں والنٹیر نہیں۔"

" سلطانہ یہاں رُک گئی۔ اس نے پُوچھا۔" یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں۔"

شنکر نے جواب دیا۔" اُلّو کے پٹھے۔"

" میں اُلّو کی پٹھی نہیں۔"

" مگر وہ آدمی خدابخش جو تمھارے ساتھ رہتا ہے ضرور اُلّو کا پٹھا ہے۔"

" کیوں ؟"

" اس لِئے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خُدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جا رہا ہے۔ جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔" یہ سن کر شنکر ہنسا۔

اس پر سُلطانہ نے کہا تُم ہندو ہو۔ اسی لِئے ہمارے بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔"

شنکر مُسکرایا۔" ایسی جگہوں پر ہندو مُسلم سوال پیدا نہیں ہُوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی بھی یہاں آئیں تو شریف آدمی بن جائیں۔"

" جانے کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو ـــــــ بولو رہو گے ؟"

" اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہُوں۔"

سُلطانہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ تو جاؤ رستہ پکڑو۔"

شنکر آرام سے اُٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہُوئے کہا۔" میں کبھی کبھی اس بازار سے گذرتا ہُوں۔ جب بھی تمھیں میری ضرورت ہو بلا لینا ـــــــ بہت کام کا آدمی ہُوں۔"

شنکر چلا گیا اور سُلطانہ کالے لباس کو بھُول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی اس آدمی کی باتوں نے اس کے دُکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ

اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا۔ مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی اس لئے شنکر کی باتیں اسے پسند آتیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس پوچھا" تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟"۔

خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا" پرانے قلعہ کے پاس سے آرہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں ——"

کچھ انہوں نے تم سے کہا؟"

" نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے —— پر سلطانہ، میں جو اُن کی خدمت کر رہا ہوں۔ وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شاملِ حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے"

سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی" سارا سارا دن غائب رہتے ہو —— میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں۔ کہیں جا سکتی ہوں نہ آسکتی ہوں۔ محرم سر پر آگیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں۔ گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا ہوگا؟ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا" پر یہ کام شروع کرنے کے لئے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیئے —— خدا کے لئے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی۔ جو کرتا

ہے۔ اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے۔ کیا پتہ ہے کچھ دیر اور تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہم......'

سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا: "تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیص پڑی ہے۔ اس کو میں رنگواؤں گی۔ سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے۔ وہی جو تم نے دیوالی پر لا کے دیا تھا۔ یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی رنگوا لیا جائے گا۔ ایک صرف شلوار کی کسر ہے۔ سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کر دو........ دیکھو تمھیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لا دو ——— میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔"

خدا بخش اٹھ بیٹھا: "اب تم خواہ مخواہ زور دیے چلی جا رہی ہو ——— میں کہاں سے لاؤں گا ——— افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس ایک پیسہ نہیں۔"

"کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لا دو۔"

"دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔"

لیکن تم کچھ نہیں کرو گے ——— تم چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کر سکتے ہو۔ جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنے گز مل جاتی تھی۔ اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟"

"اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔" یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔ "لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔"

ہوٹل سے کھانا آیا۔ دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گئے۔ صبح ہوئی۔ خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔ کچھ دیر لیٹی رہی۔ کچھ دیر سوئی رہی۔ ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی۔ کپڑے دھونے

کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد اُس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں پڑھیں۔ جن میں اس کے دیکھے ہُوئے فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہُوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی۔ جب اٹھی تو چار بج چکے تھے۔ کیونکہ دُھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہُوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکنی میں آ کھڑی ہُوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سُلطانہ بالکنی میں کھڑی رہی اب شام ہو گئی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہو گئی ——— مگر سُلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہُوئی وہ سڑک پر آتے جاتے ٹانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصے سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتہً اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اُونچی کی اور سُلطانہ کی طرف دیکھ کر مُسکرا دیا۔ سُلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اُوپر بلا لیا۔

جب شنکر اُوپر آ گیا تو سُلطانہ بہت پریشان ہُوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا۔ جیسے اس کا اپنا گھر ہے۔ چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سُلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس نے کہا۔ "تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ ——— میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہُوا کرتا۔"

سُلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہو گئی۔ کہنے لگی۔ "نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔"

شنکر اس پر مُسکرا دیا۔ "تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔"

"کیسی شرطیں؟" سُلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟"

"نکاح اور شادی کیسی؟ ——— نہ تم عمر بھر کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں ——— چھوڑو ان فضولیات کو۔ کوئی کام کی بات کرو۔

"بولو کیا بات کروں؟"

"تم عورت ہو — کوئی ایسی بات شروع کرو۔ جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔ اس دُنیا میں صرف دکانداری ہی دکانداری نہیں، کچھ اور بھی ہے۔"

سُلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔ کہنے لگی "صاف صاف کہو تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"جو دُوسرے چاہتے ہیں۔" شنکر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

تُم میں اور دُوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا۔"

"تم اور مُجھ میں کوئی فرق نہیں۔ ان اور مُجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پُوچھنا نہیں چاہئیں خُود سمجھنا چاہئیں"۔

سُلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پھر کہا۔

"میں سمجھ گئی۔"

"تو کہو کیا ارادہ ہے"

"تُم جیتے، میں ہاری۔ پر میں کہتی ہُوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہوگی۔"

"تُم غلط کہتی ہو — اسی محلے میں تمھیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے۔ جو تُم بغیر کسی احساس کے قبُول کرتی رہی ہو۔ لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجُود تم ہزاروں کی تعداد میں موجُود ہو — تمھارا نام سُلطانہ ہے نا؟"

"سُلطانہ ہی ہے۔"

شنکر اُٹھ کھڑا ہُوا اور ہنسنے لگا: "میرا نام شنکر ہے — یہ نام بھی عجیب اُوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ چلو آؤ اندر چلیں۔"

شنکر اور سُلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے نہ جانے

کس بات پر، جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا "شنکر میری بات مانو گے؟"

شنکر نے جواباً کہا۔ "پہلے بات بتاؤ۔"

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی۔ "تم کہہ گئے میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر......"

کہو کہو —— رک کیوں گئی ہو۔"

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا۔ "بات یہ ہے کہ محرم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں —— یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لئے دے دیا ہے۔"

شنکر نے یہ سن کر کہا۔ "تم چاہتی ہو کہ میں تمھیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔"

شنکر مسکرایا۔ "میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمھیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لے بس اب مطمئن ہو گئی۔" سلطانہ کے بندوں کی طرف دیکھ کر پھر اس نے پوچھا "کیا یہ بندے تم مجھے دے سکتی ہو؟"

سلطانہ نے ہنس کر کہا۔ "تم انھیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔"

اس پر شنکر نے کہا۔ "میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی بولو دیتی ہو۔"

لے لو۔" یہ کہہ کر سلطانہ نے بندے اتار کر شنکر کو دے دیئے۔ اس کے بعد اسے افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔

سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو

شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اُس نے سلطانہ کو دی اور کہا: "ساٹن کی کالی شلوار ہے
—— دیکھ لینا شاید لمبی ہو —— اب میں چلتا ہوں۔"

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اُٹھا ہے اور سیدھا اِدھر ہی چلا آیا ہے۔

سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی۔ ایسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اُسے ہوا تھا۔ اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دُور کر دیا۔

دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے آئی۔ تینوں کالے کپڑے جب اس نے پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔ اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا: "قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پر یہ شلوار نئی ہے —— کب بنوائی؟"

سلطانہ نے جواب دیا: "آج ہی درزی لایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں۔ "یہ بندے تم نے کہاں سے لیے؟"

مختار نے جواب دیا: "آج ہی منگوائے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر خاموش رہنا پڑا۔

('دھواں'، 'لذّتِ سنگ' سے)

بابو گوپی ناتھ

بابو گوپی ناتھ سے میری ملاقات سن چالیس میں ہوئی۔ ان دنوں بمبئی کا ایک ہفتہ وار پرچہ ایڈٹ کیا کرتا تھا۔ دفتر میں عبدالرحیم سینڈو ایک ناٹے قد کے آدمی کے ساتھ داخل ہوا۔ میں اس وقت لیڈر لکھ رہا تھا۔ سینڈو نے اپنے مخصوص انداز میں باآواز بلند مجھے آداب کیا اور اپنے ساتھی سے متعارف کرایا۔ "منٹو صاحب۔ بابو گوپی ناتھ سے ملیے"۔

میں نے اُٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ سینڈو نے حسب عادت میری تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیے۔ بابو گوپی ناتھ۔ تم ہندوستان کے نمبر وَن رائٹر سے ہاتھ ملا رہے ہو دھڑن تختہ ہو جاتا ہے لوگوں کا۔ ایسی ایسی کنٹی نیوٹلی ملاتا ہے کہ طبیعت صاف ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں وہ کیا چٹکلہ لکھا تھا آپ نے منٹو صاحب۔ مس خورشید نے کار خریدی۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیوں بابو گوپی ناتھ۔ ہے نہ اینٹی کی پینٹی پو؟"

عبدالرحیم سینڈو کے باتیں کرنے کے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ کنٹی نیوٹلی۔ دھڑن تختہ اور اینٹی کی پینٹی پو ایسے الفاظ اُس کی اپنی اختراع تھے۔ جن کو وہ گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ میرا تعارف کرانے کے بعد وہ بابو گوپی ناتھ کی طرف متوجہ ہوا۔ جو بہت مرعوب نظر آتا تھا۔ "آپ بابو گوپی ناتھ۔ بڑے خانہ خراب۔ لاہور سے جھک مارتے مارتے بمبے

تشریف لائے ہیں۔ ساتھ کشمیر کی ایک کبوتری ہے۔"

بابو گوپی ناتھ مسکرایا۔

عبدالرحیم سینڈو نے تعارف کو نا کافی سمجھ کر کہا۔ "نمبرون بے وقوف ہو سکتا ہے تو وہ آپ ہیں۔ لوگ ان کے مسکا لگا کر روپیہ بٹورتے ہیں۔ میں صرف باتیں کر کے ان سے ہر روز پولسن بٹر کے دو پیکٹ وصول کرتا ہوں بس منٹو صاحب۔ یہ سمجھ لیجئے کہ بڑے انٹی فلوجسٹین قسم کے آدمی ہیں۔ آپ آج شام کو ان کے فلیٹ پر ضرور تشریف لائیے۔"

بابو گوپی ناتھ نے جو خدا معلوم کیا سوچ رہا تھا چونک کر کہا۔ "ہاں ہاں ضرور تشریف لائیے منٹو صاحب۔" پھر سینڈو سے پوچھا۔ "کیوں سینڈو کیا آپ کچھ اس کا شغل کرتے ہیں۔"

عبدالرحیم سینڈو نے زور سے قہقہہ لگایا۔ "اجی ہر قسم کا شغل کرتے ہیں۔ تو منٹو صاحب آج شام کو ضرور آئیے گا۔ میں نے بھی پینی شروع کر دی ہے۔ اس لیے کہ مفت ملتی ہے۔"

سینڈو نے مجھے فلیٹ کا پتہ لکھا دیا۔ جہاں میں حسبِ وعدہ شام کو چھ بجے کے قریب پہنچ گیا۔ تین کمرے کا صاف ستھرا فلیٹ تھا۔ جس میں بالکل نیا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سینڈو اور بابو گوپی ناتھ کے علاوہ بیٹھنے والے کمرے میں دو مرد اور دو عورتیں موجود تھیں جن سے سینڈو نے مجھے متعارف کرایا۔

ایک تھا غفار سائیں۔ تہمد پوش۔ پنجاب کا ٹھیٹ سائیں۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالا۔ سینڈو نے اس کے بارے میں کہا۔ "آپ بابو گوپی ناتھ کے لیگل ایڈوائزر ہیں۔ میرا مطلب سمجھ جائیے آپ۔ ہر آدمی جس کی ناک بہتی ہو یا جس کے منہ میں سے لعاب نکلتا ہو پنجاب میں خدا کو پہنچا ہوا درویش بن جاتا ہے۔ یہ بھی بس پہنچے ہوئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں۔ لاہور سے بابو گوپی ناتھ کے ساتھ آئے ہیں۔ کیونکہ انہیں وہاں کوئی اور بیوقوف ملنے کی امید نہیں تھی۔ یہاں آپ بابو صاحب سے کریون اے کے سگریٹ اور سکاچ وسکی کے پیگ پی کر دعا کرتے رہتے ہیں کہ انجام نیک ہو ــــ"

غفار سائیں یہ سُن کر مسکراتا رہا۔

دُوسرے مرد کا نام تھا غلام علی۔ لمبا تڑنگا جوان۔ کسرتی بدن۔ مُنہ پر چیچک کے داغ۔ اس کے متعلق سینڈو نے کہا۔ یہ میرا شاگرد ہے اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ لاہور کی ایک نامی طوائف کی کنواری لڑکی اس پر عاشق ہو گئی تھی۔ بڑی بڑی کنٹی نیوٹلیاں ملائی گئیں اس کو پھانسنے کے لیے۔ مگر اس نے کہا ڈو اور ڈائی۔ میں لنگوٹ کا پکا رہوں گا۔ ایک تکئے میں بات چیت پیتے ہوئے بابو گوپی ناتھ سے مُلاقات ہو گئی۔ بس اس دن سے ان کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ ہر روز کریون اے کا ڈبہ اور کھانا پینا مقرر ہے۔"

یہ سُن کر غلام علی بھی مسکراتا رہا۔

گول چہرے والی ایک سُرخ و سفید عورت تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی کشمیر کی کبوتری ہے جس کے متعلق سینڈو نے دفتر میں ذکر کیا تھا بہت صاف ستھری عورت تھی۔ بال چھوٹے تھے۔ ایسا لگتا تھا کٹے ہوئے ہیں مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ آنکھیں شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کے خطوط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بے حد الھڑ اور ناتجربہ کار ہے۔ سینڈو نے تعارف کراتے ہوئے کہا "زینت بیگم بابو صاحب پیار سے زینو کہتے ہیں۔ ایک بڑی غرانٹ نائکہ کشمیر سے یہ سیب توڑ کر لاہور لے آئی۔ بابو گوپی ناتھ کو اپنی سی آئی ڈی سے پتہ چلا اور ایک رات لے اُڑے، مقدمہ بازی ہوئی۔ تقریباً دو مہینے تک پولس عیش کرتی رہی۔ آخر بابو صاحب نے مقدمہ جیت لیا۔ اور اسے یہاں لے آئے ——— دھڑن تختہ!

اب گہرے سانولے رنگ کی عورت باقی رہ گئی تھی جو خاموش بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ آنکھیں سُرخ تھیں جن سے کافی بے حیائی مترشح تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اس کی طرف اشارہ کیا اور سینڈو سے کہا "اس کے متعلق بھی کچھ ہو جائے۔"

سینڈو نے اس عورت کی ران پر ہاتھ مارا اور کہا "جناب یہ ہے، ٹین پٹوٹی.

رِل فِل بٹوٹی۔ مسٹر عبدالرحیم سینڈو عرف سردار بیگم ——— آپ بھی لاہور کی پیداوار ہیں۔ سن چھتیس میں مجھ سے عشق ہوا۔ دو برسوں ہی میں میرا دھڑن تختہ کر کے رکھ دیا۔ میں لاہور چھوڑ کر بھاگا۔ بابو گوپی ناتھ نے اسے یہاں بلا لیا ہے تاکہ میرا دل لگا رہے۔ اس کو بھی ایک ڈبہ کریون اے کا راشن میں ملتا ہے۔ ہر شام کو ڈھائی روپے کا مورفیا کا انجکشن لیتی ہے۔ رنگ کالا ہے۔ مگر ویسے بڑی ٹٹ فور ٹیٹ قسم کی عورت ہے۔"

سردار نے ایک ادا سے صرف اتنا کہا۔ "بکواس نہ کر۔" اس ادا میں پیشہ ور عورت کی بناوٹ تھی۔

سب سے متعارف کرانے کے بعد سینڈو نے حسبِ عادت میری تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیئے۔ میں نے کہا "چھوڑو یار۔ آؤ کچھ باتیں کریں۔"

سینڈو چلایا۔ "بوائے وسکی اینڈ سوڈا ——— بابو گوپی ناتھ لگا ہوا ایک سبزے کو۔"

بابو گوپی ناتھ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سو کے نوٹوں کا ایک پلندہ نکالا اور ایک نوٹ سینڈو کے حوالے کر دیا۔ سینڈو نے نوٹ لے کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کھڑکھڑا کر کہا۔ "او گوڈ ——— او میرے رب العالمین ——— وہ دن کب آئے گا جب میں بھی لب لگا کر نوٹ نکالا کروں گا۔ جاؤ بھئی غلام علی۔ دو بوتلیں جانی واکر سٹل گوئنگ سٹرانگ کی لے آؤ۔"

بوتلیں آئیں تو سب نے پینا شروع کی۔ یہ شغل دو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سب سے زیادہ باتیں حسبِ معمول عبدالرحیم سینڈو نے کیں۔ پہلا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے وہ چلایا۔ "دھڑن تختہ منٹو صاحب۔ وسکی ہو تو ایسی۔ حلق سے اُتر کر پیٹ میں انقلاب زندہ باد لکھتی چلی گئی ہے ——— جیو بابو گوپی ناتھ جیو۔" بابو گوپی ناتھ بے چارہ خاموش رہا۔ کبھی کبھی البتہ وہ سینڈو کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا۔ میں نے سوچا اس شخص کی اپنی رائے کوئی نہیں ہے۔ دوسرا جو کہے مان لیتا ہے۔ ضعیف الاعتقادی کا ثبوت غفار سائیں موجود تھا۔ جسے وہ بقول سینڈو اپنا لیگل ایڈوائزر بنا کر لایا تھا۔ سینڈو کا اس

سے در اصل یہ مطلب تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس سے عقیدت تھی۔ یُوں بھی مُجھے دوسرا اِن گفتگو میں معلوم ہُوا کہ لاہور میں اس کا اکثر وقت فقیروں اور درویشوں کی صحبت میں کٹتا تھا۔ یہ چیز میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ وہ کھویا کھویا سا تھا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ میں نے چنانچہ اُس سے ایک بار کہا۔ "بابو گوپی ناتھ کیا سوچ رہے ہو؟" وہ چونک پڑا "جی میں ––– میں کچھ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا اور زینت کی طرف ایک عاشقانہ نگاہ ڈالی "ان حسینوں کے متعلق سوچ رہا ہُوں ––– اور ہمیں کیا سوچ ہو گی۔"

سینڈو نے کہا۔ "بڑے خانہ خراب ہیں یہ منٹو صاحب بڑے خانہ خراب ہیں ––– لاہور کی کوئی ایسی طوائف نہیں جس کے ساتھ بابو صاحب کی کنٹی نیوٹلی نہ رہ چکی ہو۔"

بابو گوپی ناتھ نے یہ سُن کر بڑے بھونڈے انکسار کے ساتھ کہا۔ "اب کمر میں وہ دم نہیں منٹو صاحب۔"

اس کے بعد واہیات گفتگو شروع ہو گئی۔ لاہور کی طوائفوں کے سب گھرانے گنے گئے۔ کون ڈیرہ دار تھی؟ کون نٹنی تھی؟ کون کس کی نوچی تھی؟ نتھنی اُتارنے کا بابو گوپی ناتھ نے کیا دیا تھا وغیرہ وغیرہ، یہ گفتگو سردار، سینڈو، غفار سائیں اور غلام علی کے درمیان ہوتی رہی۔ ٹھیٹ لاہور کے کوٹھوں کی زبان میں مطلب تو میں سمجھتا رہا۔ مگر بعض اصطلاحیں سمجھ میں نہ آئیں۔

زینت بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ اسے گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہلکی وہسکی کا ایک گلاس بھی پیا بغیر دلچسپی کے سگریٹ بھی پیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا۔ اُسے تمباکو اور اس کے دُھوئیں سے کوئی رغبت نہیں لیکن لطف یہ ہے کہ سب سے زیادہ سگریٹ اسی نے پیئے۔ بابو گوپی ناتھ سے اُسے محبت تھی؟ اس کا پتہ مُجھے کسی بات سے نہ ملا۔ اتنا البتہ ظاہر تھا کہ بابو گوپی ناتھ کو اس کا کافی خیال تھا۔ کیونکہ زینت کی آسائش کے لِئے ہر سامان مہیا تھا۔ لیکن ایک بات مُجھے محسوس ہُوتی کہ ان

دونوں میں کچھ عجیب سا کھنچاؤ تھا۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بجائے کچھ ہٹے ہوئے سے معلوم ہوتے تھے۔

آٹھ بجے کے قریب سردار، ڈاکٹر مجید کے ہاں چلی گئی کیونکہ اُسے مورفیا کا انجکشن لینا تھا۔ غفار سائیں تین پگ لینے کے بعد اپنی تسبیح اُٹھا کر قالین پر سو گیا۔ غلام علی کو ہوٹل سے کھانا لینے کے لئے بھیج دیا گیا۔ سینڈو نے اپنی دلچسپ بکواس جب کچھ عرصے کے لئے بند کی تو بابو گوپی ناتھ نے جو اب نشے میں تھا۔ زینت کی طرف وہی عاشقانہ نگاہ ڈال کر کہا "منٹو صاحب میری زینت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں نے سوچا کیا کہوں۔ زینت کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا "بڑا نیک خیال ہے"

بابو گوپی ناتھ خوش ہو گیا "منٹو صاحب ہے بھی بڑی نیک لوگ۔ خدا کی قسم زیور کا شوق ہے نہ کسی اور چیز کا۔ میں نے کئی بار کہا۔ جانِ من مکان بنوا دوں؟ جواب کیا دیا۔ معلوم ہے آپ کو؟ ــــ کیا کروں گی مکان لے کر۔ میرا کون ہے ــــ منٹو صاحب موٹر کتنے میں آجائے گی"

میں نے کہا "مجھے معلوم نہیں"

بابو گوپی ناتھ نے تعجب سے کہا۔ کیا بات کرتے ہیں منٹو صاحب ــــ آپ کو اور کاروں کی قیمت معلوم نہ ہو۔ کل چلیے میرے ساتھ۔ زینو کے لئے موٹر لیں گے۔ میں نے اب دیکھا ہے کہ بمبئے میں موٹر ہونی ہی چاہیئے"

زینت کا چہرہ ردِ عمل سے خالی رہا۔

بابو گوپی ناتھ کا نشہ تھوڑی دیر کے بعد بہت تیز ہو گیا۔ ہمہ تن جذبات ہو کر اس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب آپ بڑے لائق آدمی ہیں۔ میں تو بالکل گدھا ہوں ــــ لیکن آپ مجھے بتایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ کل باتوں باتوں میں سینڈو نے آپ کا

ذکر کیا۔ میں نے اسی وقت ٹیکسی منگوائی اور اُس سے کہا۔ مجھے لے چلو منٹو صاحب کے پاس۔ مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجئے گا ـــــ بہت گنہ گار آدمی ہوں ـــــ وسکی منگاؤں آپ کے لئے اور۔"

میں نے کہا۔" نہیں نہیں ـــــ بہت پی چکے ہیں۔"

وہ اور زیادہ جذباتی ہو گیا:" اور پیجئے منٹو صاحب۔" یہ کہہ کر جیب سے سو سو کے نوٹوں کا پلندا نکالا اور ایک نوٹ جُدا کرنے لگا۔ لیکن میں نے سب نوٹ اُس کے ہاتھ سے لئے اور واپس اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔" سو روپے کا ایک نوٹ آپ نے غلام علی کو دیا تھا۔ اس کا کیا ہُوا؟"

مجھے دراصل کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی بابو گوپی ناتھ سے۔ کتنے آدمی اُس غریب کے ساتھ جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا بابو گوپی ناتھ بالکل گدھا ہے۔ لیکن وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مُسکرا کر کہنے لگا:" منٹو صاحب اس نوٹ میں سے جو کچھ باقی بچا وہ یا تو غلام علی کی جیب سے گر پڑے گا۔"

بابو گوپی ناتھ نے پُورا جملہ بھی ادا نہیں کیا تھا کہ غلام علی نے کمرے میں داخل ہو کر بڑے دُکھ کے ساتھ یہ اطلاع دی کہ ہوٹل میں کسی حرامزادے نے اس کی جیب میں سے سارے رُوپے نکال لئے۔ بابو گوپی ناتھ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر سو روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکالا اور غلام علی کو دے کر کہا۔" جلدی کھانا لے آؤ۔"

پانچ چھ مُلاقاتوں کے بعد مجھے بابو گوپی ناتھ کی صحیح شخصیت کا علم ہُوا۔ پُوری طرح تو خیر اِنسان کسی کو بھی نہیں جان سکتا لیکن مجھے اس کے بہت سے حالات معلوم ہوئے جو بے حد دلچسپ تھے۔

پہلے تو میں یہ کہنا چاہتا ہُوں کہ میرا یہ خیال کہ وہ پرلے درجے کا چغد ہے غلط ثابت ہُوا اُس کو اِس امر کا پُورا احساس تھا کہ سینڈو۔ غلام علی اور سردار وغیرہ جو اُس کے مصاحب بنے

ہوئے تھے مطلبی انسان ہیں۔ وہ ان سے جھڑکیاں گالیاں سب سنتا تھا لیکن غصّے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "منٹو صاحب میں نے آج تک کسی کا مشورہ رد نہیں کیا۔ جب بھی کوئی مجھے رائے دیتا ہے میں کہتا ہوں سبحان اللہ۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں لیکن میں انہیں عقل مند سمجھتا ہوں اس لئے کہ ان میں کم از کم اتنی عقل تو تھی جو مجھ میں ایسی بے وقوفی کو شناخت کر لیا جس سے ان کا اُلّو سیدھا ہو سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شروع سے فقیروں اور کنجروں کی صحبت میں رہا ہوں۔ مجھے ان سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے۔ میں ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سوچ رکھا ہے جب میری دولت بالکل ختم ہو جائے گی تو کسی تکیے میں جا بیٹھوں گا۔ رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار۔ بس دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ رنڈی کا کوٹھا تو چھوٹ جائے گا اس لئے کہ جیب خالی ہونے والی ہے۔ لیکن ہندوستان میں ہزاروں پیر ہیں۔ کسی ایک کے مزار پر چلا جاؤں گا۔"

میں نے اس سے پوچھا "رنڈی کے کوٹھے اور تکیے آپ کو کیوں پسند ہیں؟"

کچھ دیر سوچ کر اُس نے جواب دیا "اس لئے کہ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اس کے لئے ان سے اچھا مقام اور کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے ایک اور سوال کیا "آپ کو طوائفوں کا گانا سننے کا شوق ہے کیا آپ موسیقی کی سمجھ رکھتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "بالکل نہیں اور یہ اچھا ہے کیونکہ میں کن سُری سے کن سُری طوائف کے ہاں جا کر بھی اپنا سر ہلا سکتا ہوں ——— منٹو صاحب مجھے گانے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن جیب میں سے دس یا سو روپے کا نوٹ نکال کر گانے والی کو دکھانے میں بہت مزا آتا ہے۔ نوٹ نکالا اور اس کو دکھایا۔ وہ اُسے لینے کے لئے ایک ادا سے اٹھی۔ پاس آئی تو نوٹ جراب میں اُڑس لیا۔ اس نے جھک کر اُسے باہر نکالا تو ہم خوش ہو گئے۔ ایسی بہت

فضول فضول سی باتیں ہیں جو ہم ایسے تماش بینوں کو پسند ہیں ورنہ کون نہیں جانتا کہ رنڈی کے کوٹھے پر ماں باپ اپنی اولاد سے پیشہ کراتے ہیں اور مقبروں اور تکیوں میں اِنسان اپنے خُدا سے:

بابو گوپی ناتھ کا شجرۂ نسب تو میں نہیں جانتا۔ لیکن اتنا معلوم ہُوا کہ وہ ایک بہت بڑے کنجوس بنئے کا بیٹا ہے۔ باپ کے مرنے پر اُسے دس لاکھ رُوپے کی جائداد ملی جو اس نے اپنی خواہش کے مطابق اُڑانا شروع کر دی بمبئے آتے وقت وہ اپنے ساتھ پچاس ہزار رُوپے لایا تھا۔ اُس زمانے میں سب چیزیں سستی تھیں لیکن پھر بھی ہر روز تقریباً سو سوا سو رُوپے خرچ ہو جاتے تھے۔

زینو کے لِئے اس نے فییٹ موٹر خریدی۔ یاد نہیں رہا۔ لیکن شاید تین ہزار رُوپے میں آئی تھی۔ ایک ڈرائیور رکھا لیکن وہ بھی لفنگے ٹائپ کا۔ بابو گوپی ناتھ کو کچُھ ایسے ہی آدمی پسند تھے۔

ہماری مُلاقاتوں کا سِلسلہ بڑھ گیا۔ بابو گوپی ناتھ سے مُجھے تو صرف دلچسپی تھی۔ لیکن اُسے مجُھ سے کچُھ عقیدت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دُوسروں کی بہ نسبت میرا زیادہ احترام کرتا تھا۔

ایک روز شام کے قریب جب میں فلیٹ پر گیا تو مُجھے وہاں شفیق کو دیکھ کر سخت حیرانی ہُوئی۔ محمد شفیق طوسی کہوں تو شاید آپ سمجھ لیں کہ میری مُراد کس آدمی سے ہے۔ یُوں تو شفیق کافی مشہُور آدمی ہے۔ کچُھ اپنی جدت طراز گائگی کے باعث اور کچُھ اپنی بذلہ سنج طبیعت کی بدولت لیکن اس کی زندگی کا ایک حصّہ اکثریت سے پوشیدہ ہے۔ بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ تین سگی بہنوں کو یکے بعد دیگرے تین تین چار چار سال کے وقفے کے بعد داشتہ بنانے سے پہلے اُس کا تعلق ان کی ماں سے بھی تھا۔ یہ بھی بہت کم مشہُور ہے کہ اس کو اپنی پہلی بیوی جو تھوڑے ہی عرصے میں مر گئی تھی اس لِئے پسند نہیں تھی کہ اس میں طوائفوں کے غمزے اور عشوے نہیں تھے۔ لیکن یہ تو خیر ہر آدمی جو شفیق طوسی سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے جانتا ہے کہ چالیس برس (یہ اس زمانے کی عُمر ہے) کی عُمر میں سینکڑوں طوائفوں نے اسے رکھا۔ اچھے سے اچھا کپڑا پہنا۔ عمدہ سے عمدہ کھانا کھایا۔ نفیس سے نفیس موٹر رکھی۔ مگر اس نے اپنی گرہ

سے کسی طوائف پر ایک دمڑی بھی خرچ نہ کی۔

عورتوں کے لئے۔ خاص طور پر جو کہ پیشہ ور ہوں۔ اس کی بذلہ سنج طبیعت جس میں میراثیوں کے مزاج کی جھلک تھی، بہت ہی جاذبِ نظر تھی۔ وہ کوشش کئے بغیر ان کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔

میں نے جب اسے ہنس ہنس کر زینت سے باتیں کرتے دیکھا تو مجھے اس لئے حیرت نہ ہُوئی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ میں نے صرف یہ سوچا کہ وہ دفعتہً یہاں پہنچا کیسے۔ ایک سینڈو اسے جانتا تھا۔ مگر ان کی بول چال تو ایک عرصے سے بند تھی۔ لیکن بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ سینڈو ہی اُسے لایا تھا۔ اُن دونوں میں صُلح صفائی ہو گئی تھی۔

بابو گوپی ناتھ ایک طرف بیٹھا حُقہ پی رہا تھا۔ میں نے شاید اس سے پہلے ذکر نہیں کیا۔ وہ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا۔ محمد شفیق طوسی میراثیوں کے لطیفے سُنا رہا تھا۔ جس میں زینت کسی قدر کم اور سردار بہت زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ شفیق نے مجھے دیکھا اور کہا۔

"او بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ کیا آپ کا گذر بھی اس وادی میں ہوتا ہے؟"

سینڈو نے کہا۔ "تشریف لے آیئے عزرائیل صاحب یہاں دھڑن تختہ۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

تھوڑی دیر گپ بازی ہوتی رہی۔ میں نے نوٹ کیا کہ زینت اور محمد شفیق طوسی کی نگاہیں آپس میں ٹکرا کر کچھ اور بھی کہہ رہی ہیں۔ زینت اس فن میں بالکل کوری تھی لیکن شفیق کی مہارت زینت کی خامیوں کو چھپاتی رہی۔ سردار دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے کے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔

اس دوران میں مَیں بھی زینت سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ جس پر مجھے اعتراض نہیں تھا۔ اچھی ملنسار طبیعت کی عورت تھی۔ کم گو۔ سادہ لوح

صاف ستھری۔

شفیق سے مجھے اس کی نگاہ بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اوّل تو اس میں بھونڈا پن تھا، اس کے علاوہ ـــــ کچھ یوں کہیے کہ اس بات کا بھی اُس میں دخل تھا کہ وہ مجھے بھائی کہتی تھی۔ شفیق اور سینڈو اُٹھ کر باہر گئے تو میں نے شاید بڑی بے رحمی کے ساتھ اس سے نگاہ بازی کے متعلق استفسار کیا کیونکہ فوراً اس کی آنکھوں میں یہ موٹے موٹے آنسو آ گئے اور روتی روتی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بابو گوپی ناتھ جو ایک کونے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اُٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے چلا گیا۔ سردار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے کچھ کہا۔ لیکن میں مطلب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بابو گوپی ناتھ کمرے سے باہر نکلا اور "آئیے منٹو صاحب" کہہ کر مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

زینت پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ میں اور بابو گوپی ناتھ دونوں پلنگ کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بابو گوپی ناتھ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا: "منٹو صاحب مجھے اس عورت سے بہت محبت ہے۔ دو برس سے یہ میرے پاس ہے۔ میں حضرت غوثِ اعظم جیلانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ اس کی دوسری بہنیں۔ میرا مطلب ہے اس پیشے کی دوسری عورتیں دونوں ہاتھوں سے مجھے لُوٹ کر کھاتی رہیں۔ مگر اس نے کبھی ایک زائد پیسہ مجھ سے نہیں لیا۔ میں اگر کسی دوسری عورت کے ہاں ہفتوں پڑا رہا تو اس غریب نے اپنا کوئی زیور گرو رکھ کر گزارہ کیا۔ میں جیسا کہ آپ سے ایک دفعہ کہہ چکا ہوں بہت جلد اس دُنیا سے کنارہ کش ہونے والا ہوں۔ میری دولت اب کچھ دن کی مہمان ہے۔ میں نہیں چاہتا اس کی زندگی خراب ہو۔ میں نے لاہور میں اس کو بہت سمجھایا کہ تم دوسری طوائفوں کی طرف دیکھو۔ جو کچھ وہ کرتی ہیں سیکھو۔ میں آج دولت مند ہوں۔ کل مجھے بھکاری ہونا ہے۔ تم لوگوں کی زندگی میں صرف ایک دولت مند کافی نہیں۔ میرے بعد تم کسی اور کو نہیں پھانسو گی

تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن منٹو صاحب اس نے میری ایک نہ سُنی۔ سارا دن شریف زادیوں کی طرح گھر میں بیٹھی رہتی۔ میں نے غفار سائیں سے مشورہ کیا۔ اُس نے کہا بمبئی لے جاؤ۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے ایسے کیوں کہا۔ بمبئی میں اس کی دو جاننے والی طوائفیں ایکٹرسیں بنی ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے سوچا بمبئی ٹھیک ہے۔ دو مہینے ہو گئے ہیں اسے یہاں لائے ہوئے۔ سردار کو لاہور سے بلایا ہے کہ اس کو سب گُر سکھائے۔ غفار سائیں سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔ اس کو یہ خیال تھا کہ بابو تمہاری بے عزتی ہوگی۔ میں نے کہا تم چھوڑو اس کو۔ بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ لاکھوں رئیس ہیں۔ میں نے تمہیں موٹر لے دی ہے۔ کوئی اچھا آدمی تلاش کر لو ــــــ منٹو صاحب میں خُدا کی قسم کھا کر کہتا ہُوں میری دلی خواہش ہے کہ یہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ اچھی طرح ہوشیار ہو جائے۔ میں اس کے نام آج ہی بنک میں دس ہزار رُوپیہ جمع کرانے کو تیار ہُوں۔ مگر مجھے معلوم ہے دس دن کے اندر اندر یہ باہر بیٹھی ہُوئی سردار اس کی ایک ایک پائی جیب میں ڈال لے گی ــــ آپ بھی اسے سمجھائیے کہ چالاک بننے کی کوشش کرے۔ جب سے موٹر خریدی ہے۔ سردار اسے ہر روز شام کو اپولو بندر لے جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک کامیابی نہیں ہُوئی۔ سینڈو آج بڑی مشکلوں سے محمد شفیق کو یہاں لایا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ اُس کے متعلق؟

میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا مناسب خیال نہ کیا لیکن بابو گوپی ناتھ نے خُود ہی کہا۔ "اچھا کھاتا پیتا آدمی معلوم ہوتا ہے اور خوبصورت بھی ہے ــــ کیوں زینو جانی ــــ پسند ہے تمہیں؟"

زینو خاموش رہی۔

بابو گوپی ناتھ سے جب مجھے زینت کو بمبئی لانے کی غرض و غایت معلوم ہُوئی تو میرا دماغ چکرا گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن بعد میں مشاہدے نے میری حیرت دُور کر دی۔ بابو گوپی ناتھ کی دلی آرزو تھی کہ زینت بمبئی میں کسی اچھے مالدار آدمی کی داشتہ

بن جائے یا ایسے طریقے سیکھ جائے۔ جس سے وہ مختلف آدمیوں سے روپیہ وصول کرتے رہنے میں کامیاب ہو سکے۔

زینت سے اگر صرف چھٹکارا ہی حاصل کرنا ہو تو یہ کوئی اتنی مشکل چیز نہیں تھی۔ بابو گوپی ناتھ ایک ہی دن میں یہ کام کر سکتا تھا۔ چونکہ اس کی نیت نیک تھی اس لئے اُس نے زینت کے مستقبل کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اُس کو ایکٹرس بنانے کے لیے اُس نے کئی جعلی ڈائریکٹروں کی دعوتیں کیں۔ گھر میں ٹیلیفون لگوا دیا۔ لیکن اُونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھا۔

محمد شفیق طوسی تقریباً ڈیڑھ مہینہ آتا رہا۔ کئی راتیں بھی اس نے زینت کے ساتھ بسر کیں لیکن وہ ایسا آدمی نہیں تھا جو کسی عورت کا سہارا بن سکے۔ بابو گوپی ناتھ نے ایک روز افسوس اور رنج کے ساتھ کہا "شفیق صاحب تو خالی خولی جنٹلمین ہی نکلے۔ ٹھسّہ دیکھئے۔ لیکن بے چاری زینت سے چار چادریں۔ چھ تکیئے کے غلاف اور دو سو روپے نقد ہتھیا کر لے گئے۔ سُنا ہے آجکل ایک لڑکی الماس سے عشق لڑا رہے ہیں۔"

یہ دُرست تھا۔ الماس نذیر جان پٹیالے والی کی سب سے چھوٹی اور آخری لڑکی تھی۔ اس سے پہلے تین بہنیں شفیق کی داشتہ رہ چکی تھیں۔ دو سو روپے جو اس نے زینت سے لئے تھے۔ مجھے معلوم ہے الماس پر خرچ ہوئے تھے۔ بہنوں کے ساتھ لڑ جھگڑ کر الماس نے زہر کھا لیا تھا۔ محمد شفیق طوسی نے جب آنا جانا بند کر دیا تو زینت نے کئی بار مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا اسے ڈھونڈ کر میرے پاس لائیے۔ میں نے اُسے تلاش کیا۔ لیکن کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ ایک روز اتفاقیہ ریڈیو اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ تمہیں زینت بلاتی ہے۔ تو اس نے جواب دیا "مجھے یہ پیغام اور ذریعوں سے بھی مل چکا ہے۔ افسوس ہے۔ آج کل مجھے بالکل فرصت نہیں۔ زینت بہت اچھی عورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے —— ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

شفیق سے جب مایوسی ہوئی تو زینت نے سردار کے ساتھ پھر اپالو بندر جانا شروع کیا۔ پندرہ دنوں میں بڑی مشکلوں سے کئی گیلن پٹرول پھونکنے کے بعد سردار نے دو آدمی پھانسے۔ ان سے زینت کو چار سو روپے ملے۔ بابو گوپی ناتھ نے سمجھا کہ حالات امید افزا ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک نے جو ریشمی کپڑوں کی مل کا مالک تھا۔ زینت سے کہا تھا کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ ایک مہینہ گذر گیا۔ لیکن یہ آدمی پھر زینت کے پاس نہ آیا۔

ایک روز میں جانے کس کام سے ہار نبی روڈ پر جا رہا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ کے پاس زینت کی موٹر کھڑی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر محمد یٰسین بیٹھا تھا۔ نگینہ ہوٹل کا مالک۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ موٹر تم نے کہاں سے لی؟"

یٰسین مسکرایا۔ "تم جانتے ہو موٹر والی کو؟"

میں نے کہا "جانتا ہوں۔"

"تو بس سمجھ لو میرے پاس کیسے آئی ——— اچھی لڑکی ہے یار۔" یٰسین نے مجھے آنکھ ماری۔ میں مسکرایا۔

اس کے چوتھے روز بابو گوپی ناتھ ٹیکسی پر میرے دفتر میں آیا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ زینت سے یٰسین کی ملاقات کیسے ہوئی۔ ایک شام اپالو بندر سے ایک آدمی لے کر سردار اور زینت نگینہ ہوٹل گئیں۔ وہ آدمی تو کسی بات پر جھگڑ کر چلا گیا۔ لیکن ہوٹل کے مالک سے زینت کی دوستی ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ مطمئن تھا کیونکہ دس پندرہ روز کی دوستی کے دوران میں یٰسین نے زینت کو بہت ہی عمدہ اور قیمتی ساڑھیاں لے دی تھیں۔ بابو گوپی ناتھ اب یہ سوچ رہا تھا کہ کچھ دن اور گذر جائیں۔ زینت اور یٰسین کی دوستی اور مضبوط ہو جائے تو لاہور واپس چلا جائے ——— مگر ایسا نہ ہوا۔

نگینہ ہوٹل میں ایک کرسچین عورت نے کمرہ کرائے پر لیا۔ اس کی جوان لڑکی میوریل

سے ییلین کی آنکھ لڑگئی چنانچہ زینت بے چاری ہوٹل میں بیٹھی رہتی اور ییلین اس کی موٹر میں صبح شام اس لڑکی کو گھماتا رہتا۔ بابو گوپی ناتھ کو اس کا علم ہونے پر بہت دُکھ ہُوا۔ اس نے مجھ سے کہا: "منٹو صاحب یہ کیسے لوگ ہیں۔ بھئی دل اچاٹ ہو گیا ہے تو صاف کہہ دو۔ لیکن زینت بھی عجیب ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے کیا ہو رہا ہے مگر مُنہ سے اتنا بھی نہیں کہتی میاں اگر تُم نے اس کرسٹان چھوکری سے عشق لڑانا ہے تو اپنی موٹر کا بندوبست کرو۔ میری موٹر کیوں استعمال کرتے ہو ——— میں کیا کروں منٹو صاحب بڑی شریف اور نیک بخت عورت ہے ——— کچھ سمجھ میں نہیں آتا ——— تھوڑی سی چالاک تو بننا چاہیئے۔"

ییلین سے تعلق قطع ہونے پر زینت نے کوئی صدمہ محسوس نہ کیا۔

بہت دنوں تک کوئی بات وقوع پذیر نہ ہُوئی۔ ایک دن ٹیلیفون کیا تو معلوم ہُوا بابو گوپی ناتھ غلام علی اور غفار سائیں کے ساتھ لاہور چلا گیا ہے۔ رُوپے کا بندوبست کرنے کیونکہ پچاس ہزار ختم ہو چکے تھے۔ جاتے وقت وہ زینت سے کہہ گیا تھا کہ اُسے لاہور میں زیادہ دن لگیں گے کیونکہ اُسے چند مکان فروخت کرنے پڑیں گے۔

سردار کو مورفیا کے ٹیکوں کی ضرورت تھی۔ سینڈو کو پولسن مکھن کی۔ چنانچہ دونوں نے متحدہ کوشش کی اور ہر روز دو تین آدمی پھانس کر لے آتے۔ زینت سے کہا گیا کہ بابو گوپی ناتھ واپس نہیں آئے گا۔ اس لئے اسے اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ سو سوا سو رُوپے روز کے ہو جاتے جن میں سے آدھے زینت کو ملتے باقی سینڈو اور سردار دبا لیتے۔

میں نے ایک دن زینت سے کہا: "یہ تُم کیا کر رہی ہو؟"

اس نے بڑے الھڑپن سے کہا: "مجھے کچھ معلوم نہیں ہے بھائی جان۔ یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں مان لیتی ہوں۔"

جی چاہا تھا کہ دیر تک پاس بیٹھ کر سمجھاؤں کہ جو کچھ تُم کر رہی ہو ٹھیک نہیں۔ سینڈو اور سردار اپنا اُلو سیدھا کرنے کے لِئے تمہیں بیچ بھی ڈالیں گے۔ مگر میں نے کچھ نہ کہا۔ زینت

مُرکتا دینے والی حد تک بے مجھ۔ بے اُمنگ اور بے جان عورت تھی۔ اس کم بخت کو اپنی زندگی کی کچھ قدر و قیمت ہی معلوم نہیں تھی۔ جسم بیچتی مگر اس میں بیچنے والوں کا کوئی انداز تو ہوتا۔ واللہ مجھے کوفت ہوتی تھی۔ اُسے دیکھ کر۔ سگرٹ سے، شراب سے، کھانے سے، گھر سے، ٹیلیفون سے، حتٰی کہ اُس صوفے سے بھی جس پر وہ اکثر لیٹی رہتی تھی۔ اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

بابو گوپی ناتھ پُورے ایک مہینے کے بعد لوٹا۔ ناہم گیا تو وہاں فلیٹ میں کوئی اور ہی تھا۔ سینڈو اور سردار کے مشورے سے زینت نے باندرہ میں ایک بنگلے کا بالائی حصہ کرائے پر لے لیا تھا۔ بابو گوپی ناتھ میرے پاس آیا تو میں نے اُسے پُورا پتہ بتا دیا۔ اس نے مجھ سے زینت کے متعلق پُوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے کہہ دیا۔ لیکن یہ نہ کہا کہ سینڈو اور سردار اس سے پیشہ کرا رہے ہیں۔

بابو گوپی ناتھ اب کی دس ہزار رُوپیہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ جو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ غلام علی اور غفار سائیں کو وہ لاہور ہی چھوڑ آیا تھا۔ ٹیکسی نیچے کھڑی تھی۔ بابو گوپی ناتھ نے اصرار کیا کہ میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔

قریباً ایک گھنٹے میں ہم باندرہ پہنچ گئے۔ پالی ہل پر ٹیکسی چڑھ رہی تھی کہ سامنے تنگ سڑک پر سینڈو دکھائی دیا۔ بابو گوپی ناتھ نے زور سے پکارا "سینڈو"

سینڈو نے جب بابو گوپی ناتھ کو دیکھا تو اُس کے مُنہ سے صرف اس قدر نکلا "دھڑن تختہ!"

بابو گوپی ناتھ نے اس سے کہا "آؤ ٹیکسی میں بیٹھ جاؤ۔ اور ساتھ چلو" لیکن سینڈو نے کہا۔ "ٹیکسی ایک طرف کھڑی کیجئے۔ مجھے آپ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں۔"

ٹیکسی ایک طرف کھڑی کی گئی۔ بابو گوپی ناتھ باہر نکلا تو سینڈو اسے کچھ دُور لے گیا۔ دیر تک اُن میں باتیں ہوتی رہیں۔ جب ختم ہُوئیں تو بابو گوپی ناتھ اکیلا ٹیکسی کی طرف آیا ڈرائیور سے اس نے کہا "واپس لے چلو"

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ہم دادر کے پاس پہنچے تو اس نے کہا "منٹو صاحب زینو

کی شادی ہونے والی ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "کس سے"؟

بابو گوپی ناتھ نے جواب دیا۔ حیدر آباد سندھ کا ایک دولت مند زمیندار ہے۔ خُدا کرے دونوں خُوش رہیں۔ یہ بھی اچھا ہے جو میں عین وقت پر آپہنچا۔ جو روپے میرے پاس ہیں ان سے زینو کا جہیز بن جائے گا ــــ کیوں کیا خیال ہے آپ کا؟"

میرے دماغ میں اس وقت کوئی خیال نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ حیدر آباد سندھ کا دولت مند زمیندار کون ہے؟ سینڈو اور سردار کی کوئی جعل سازی تو نہیں۔ لیکن بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی کہ وہ حقیقتاً حیدر آباد کا متمول زمیندار ہے جو حیدر آباد سندھ ہی کے ایک میوزک ٹیچر کی معرفت زینت سے متعارف ہُوا۔ یہ میوزک ٹیچر زینت کو گانا سکھلانے کی بے سُود کوشش کیا کرتا تھا۔ ایک روز یہ اپنے مربّی غلام حسین (یہ اسی حیدر آباد سندھ کے رئیس کا نام تھا) کو ساتھ لے کر آیا۔ زینت نے خُوب خاطر مدارت کی۔ غلام حسین کی پُر زور فرمائش پر اس نے غالب کی غزل۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے

گا کر سنائی غلام حسین سو جان سے اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ اُس کا ذکر میوزک ٹیچر نے زینت سے کیا۔ سردار اور سینڈو نے مِل کر معاملہ پکا کر دیا اور شادی طے ہو گئی۔

بابو گوپی ناتھ خوش تھا۔ ایک دفعہ سینڈو کے دوست کی حیثیت سے وہ زینت کے ہاں گیا۔ غلام حسین سے اس کی ملاقات ہُوئی۔ اس سے مل کر بابو گوپی ناتھ کی خُوشی دوگنی ہو گئی۔ مجھ سے اس نے کہا: "منٹو صاحب خوبصورت۔ جوان اور بڑا لائق آدمی ہے ــــ میں نے یہاں آتے ہُوئے داتا گنج بخش کے حضُور جا کر دُعا مانگی تھی۔ جو قبول ہُوئی ــــ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں۔"

بابو گوپی ناتھ نے بڑے خلُوص اور بڑی توجہ سے زینت کی شادی کا انتظام کیا۔ دو

ہزار کے زیور دو ہزار کے کپڑے بنوا دیئے۔ اور پانچ ہزار نقد دیئے۔

محمد شفیق طوسی۔ محمد یسین پروپرائٹر نگینہ ہوٹل۔ سینڈو میوزک ٹیچر، میں اور گوپی ناتھ شادی میں شامل تھے۔ دُولہن کی طرف سے سینڈو وکیل تھا۔

ایجاب و قبول ہُوا تو سینڈو نے آہستہ سے کہا۔ "دھڑن تختہ!"

غلام حسین سرج کا نیلا سُوٹ پہنے تھا۔ سب نے اس کو مُبارکباد دی جو اُس نے خندہ پیشانی سے قبُول کی۔ کافی وجیہہ آدمی تھا۔ بابو گوپی ناتھ اس کے مقابلے میں چھوٹی سی بٹیر معلوم ہوتا تھا۔

شادی کی دعوتوں پر خورد و نوش کا جو سامان بھی ہوتا ہے بابو گوپی ناتھ نے مہیا کیا تھا۔ دعوت سے جب لوگ فارغ ہُوئے تو بابو گوپی ناتھ نے سب کے ہاتھ دھلوائے۔ میں جب ہاتھ دھونے کے لیے آیا تو اس نے مجھ سے بچّوں کے انداز میں کہا۔ "منٹو صاحب ذرا اندر جائیے اور دیکھئے زینو دلہن کے لباس میں کیسی لگتی ہے۔"

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہُوا۔ زینت سُرخ زربفت کا شلوار کُرتہ پہنے تھی — دوپٹہ بھی اسی رنگ کا تھا جس پر گوٹ لگی تھی۔ چہرے پہ ہلکا ہلکا میک اپ تھا۔ حالانکہ مجھے ہونٹوں پہ لپ اسٹک کی سُرخی بہت بُری معلوم ہوتی ہے۔ مگر زینت کے ہونٹ سجے ہُوئے تھے۔ اس نے شرما کر مجھے آداب کیا تو بہت پیاری لگی۔ لیکن جب میں نے دُوسرے کونے میں ایک مسہری دیکھی جس پر پھُول تھے تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ "یہ کیا مسخرہ پن ہے؟"

زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا۔ "آپ مذاق کرتے ہیں بھائی جان!" اُس نے یہ کہا اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

مجھے ابھی غلطی کا احساس بھی نہ ہُوا تھا کہ بابو گوپی ناتھ اندر داخل ہُوا۔ بڑے پیار کے ساتھ اس نے اپنے رُومال کے ساتھ زینت کے آنسو پونچھے اور بڑے دُکھ کے ساتھ مجھ

سے کہا: "منٹو صاحب میں سمجھا تھا کہ آپ بڑے سمجھدار اور لائق آدمی ہیں —— زینو کا مذاق اُڑانے سے پہلے آپ نے سوچ لیا ہوتا۔"

بابو گوپی ناتھ کے لہجے میں وہ عقیدت جو مجھ سے تھی زخمی نظر آئی۔ لیکن پیشتر اس کے میں اس سے معافی مانگوں اس نے زینت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا "خدا تمھیں خوش رکھے۔"

یہ کہہ کر بابو گوپی ناتھ نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان میں ملامت تھی —— بہت ہی دُکھ بھری ملامت —— چلا گیا۔

('چغد' سے)

”یہ لوگ اُونچے ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں سے غافل ہو جاتے ہیں، بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کے کردار ان کے خیالات اور عقیدے تو ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے، لیکن ان کے منڈے ہوئے سر، ان کے بدن کی راکھ اور ان کے گیروے کپڑے سادہ لوح انسانوں کے دماغ میں رہ جائیں گے..... دُنیا میں اتنے مصلح پیدا ہوئے ہیں، ان کی تعلیم تو لوگ بھول چکے ہیں لیکن صلیبیں، دھاگے، ڈاڑھیاں، کڑے اور بغلوں کے بال رہ گئے ہیں۔“

(سوراج کے لئے — نمرود کی خدائی)

حافظ حسن دین

حافظ حسن دین جو دونوں آنکھوں سے اندھا تھا ظفر شاہ کے گھر میں آیا۔ پٹیلے کا ایک دوست رمضان علی تھا جس نے ظفر شاہ سے اس کا تعارف کرایا۔ وہ حافظ صاحب سے مل کر بہت متاثر ہُوا۔ گو اُن کی آنکھیں دیکھتی نہیں تھیں مگر ظفر شاہ نے یُوں محسوس کیا کہ اُس کو ایک نئی بصارت مل گئی ہے۔

ظفر شاہ ضعیف اعتقاد تھا۔ اس کو پیروں فقیروں سے بڑی عقیدت تھی۔ جب حافظ حسن دین اُس کے پاس آیا تو اُس نے اُس کو اپنے فلیٹ کے نیچے موٹر گراج میں ٹھہرایا اس کو وہ وائٹ ہاؤس کہتا تھا۔

ظفر شاہ سید تھا۔ مگر اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مکمل سید نہیں ہے۔ چُنانچہ اُس نے حافظ دین کی خدمت میں گذارش کی کہ وہ ان کی تکمیل کر دیں۔ حافظ صاحب نے تھوڑی دیر بعد اپنی بے نور آنکھیں گھما کر اُس کو جواب دیا۔ "بیٹا ــــ تو پُورا سید بننا چاہتا ہے تو غوثِ اعظم جیلانی سے اجازت لینا پڑے گی۔"

"تو آپ ازراہِ کرم اجازت لے لیجئے۔"

حافظ صاحب نے پھر اپنی بے نور آنکھیں گھمائیں۔ "اُن کے حضور میں تو فرشتوں کے

بھی پر جلتے ہیں۔"

ظفر شاہ کو بڑی نا امیدی ہوئی۔ "آپ صاحبِ کشف ہیں — کوئی مداوا تو ہوگا۔"

حافظ صاحب نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ "ہاں چِلّا کاٹنا پڑے گا مجھے۔"

اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو اپنے اس خادم کے لئے کاٹ لیجئے۔"

"سوچوں گا۔"

حافظ حسن دین ایک مہینے تک سوچتا رہا۔ اس دوران میں ظفر شاہ نے اس کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ حافظ صاحب کے لئے صبح اٹھتے ہی ڈیڑھ پاؤ بادام توڑتا۔ ان کے مغز نکال کر سردائی تیار کرتا۔ دوپہر کو ایک سیر گوشت بھنوا کے اُن کی خدمت میں پیش کرتا شام کو بالائی ملی ہوئی چائے پلاتا۔ رات کو ایک مُرغ مسلّم حاضر ہوتا۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ آخر حافظ حسن دین نے ظفر شاہ سے کہا۔ "اب مجھے آوازیں آنی شروع ہو گئی ہیں۔"

ظفر شاہ نے پوچھا۔ "کیسی آوازیں قبلہ۔"

"تمہارے متعلق۔"

"کیا کہتی ہیں۔"

"تم ایسی باتوں کے متعلق مت پوچھا کرو۔"

"معافی چاہتا ہوں۔"

حافظ صاحب نے ٹٹول ٹٹول کر مرغ کی ٹانگ اُٹھائی اور اُسے دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم اصل میں منکر ہو — آزمانا چاہتے ہو تو کسی کنوئیں پر چلو۔"

ظفر شاہ تھرتھرایا۔ "حضور، میں آپ کو آزمانا نہیں چاہتا — آپ کا ہر لفظ صداقت سے لبریز ہے۔"

حافظ صاحب نے سر کو زور سے جنبش دی۔ "نہیں — ہم چاہتے ہیں تم ہمیں

آزماؤ ـــــ کھانا کھالیں تو ہمیں کسی بھی کنویں پر لے چلو۔"

"وہاں کیا ہوگا قبلہ۔"

"میرا معمول آواز دے گا ـــــ وہ کنواں پانی سے لبالب بھر جائے گا۔ اور تمہارے پاؤں گیلے ہو جائیں گے ـــــ ڈرو گے تو نہیں؟۔"

ظفر شاہ ڈر گیا تھا۔ حافظ حسن دین جس لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ بڑا پُر ہیبت تھا ـــــ لیکن اُس نے اس خوف پر قابو پا کر حافظ صاحب سے کہا۔" جی نہیں ـــــ آپ کی ذاتِ اقدس میرے ساتھ ہوگی تو ڈر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

جب سارا مُرغ ختم ہو گیا تو حافظ صاحب نے ظفر شاہ سے کہا۔"میرے ہاتھ دھلواؤ اور کسی کنویں پر لے چلو۔"

ظفر شاہ نے اُس کے ہاتھ دھلوائے۔ تولیئے سے ہاتھ پونچھے اور اُسے کنویں پر لے گیا جو شہر سے کافی دُور تھا۔ حافظ حسن دین چادر لپیٹ کر اس کی منڈیر کے پاس بیٹھ گیا۔ مگر حافظ صاحب نے چلّا کر کہا۔" پانچ قدم پیچھے ہٹ جاؤ ـــــ میں پڑھنے والا ہوں۔ کنویں کا پانی لبالب بھر جائے گا ـــــ تُم ڈر جاؤ گے۔"

ظفر شاہ ڈر کر دس قدم پیچھے ہٹ گیا، حافظ صاحب نے پڑھنا شرُوع کر دیا۔ رمضان علی بھی ساتھ تھا۔ جس نے ظفر شاہ سے حافظ صاحب کا تعارف کرایا تھا وُہ دُور بیٹھا مونگ پھلی کھا رہا تھا۔

حافظ صاحب نے کنویں پر آنے سے پہلے ظفر شاہ سے کہا تھا کہ دو سیر چاول۔ ڈیڑھ سیر شکر اور پاؤ بھر کالی مرچوں کی ضرورت ہے۔ جو اس کا معمول کھا جائے گا ـــــ یہ تمام چیزیں حافظ صاحب کی چادر میں بندھی تھیں۔

دیر تک حافظ حسن دین معلوم نہیں کس زبان میں پڑھتا رہا۔ مگر اس کے معمول کی کوئی آواز نہ آئی ـــــ نہ کنویں کا پانی اوپر چڑھا۔ حافظ نے چاول۔ شکر اور مرچیں کنویں

میں پھینک دیں۔ پھر بھی کچھ نہ ہوا ــــ چند لمحات مکمل سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد حافظ پر جذب کی سی کیفیت طاری ہوئی اور بلند آواز میں بولا۔ "ظفر شاہ کو کراچی لے جاؤ ــــ اس سے پانچ سو روپے لو اور گوجرانوالہ میں زمین الاٹ کرالو۔"

ظفر شاہ نے پانچ سو روپے حافظ کی خدمت پیش کر دیئے۔ اُس نے یہ رُوپے اپنی جیب میں ڈال کر اُس سے بڑے جلال میں کہا ــــ ظفر شاہ ــــ تو یہ روپے دے کر سمجھتا ہے، مجھ پر کوئی احسان کیا ہے۔"

ظفر شاہ نے سرتاپا عجز بن کر کہا۔ "نہیں حضور ــــ میں نے تو آپ کے ارشاد کی تعمیل کی ہے۔"

حافظ حسن دین کا لہجہ ذرا نرم ہو گیا۔ "دیکھو، سردیوں کا موسم ہے، ہمیں ایک دُھسّے کی ضرورت ہے۔"

"چلیئے ابھی خرید لیتے ہیں۔"

"دو گھوڑے کی بوسکی کی قمیص اور ایک پمپ شُو۔"

ظفر شاہ نے غلاموں کی طرح کہا۔ "حضور آپ کے حُکم کی تعمیل ہو جائے گی۔"

حافظ صاحب کے حُکم کی تعمیل ہو گئی۔ پانچ سو روپے کا دُھسّہ۔ پچاس رُوپے کی قراقلی کی ٹوپی۔ بیس رُوپے کا پمپ شُو ــــ ظفر شاہ خُوش تھا۔ کہ اس نے ایک پہنچے ہُوئے بزرگ کی خدمت کی ہے۔

حافظ صاحب وائٹ ہاؤس میں سو رہے تھے۔ کہ اچانک بُڑبڑانے لگے۔ ظفر شاہ فرش پر لیٹا تھا۔ اُس کی آنکھ لگنے ہی والی تھی۔ کہ چونک کر سننے والا تھا۔ حافظ صاحب کہہ رہے تھے۔ "حُکم ہُوا ہے ــــ ابھی ابھی حُکم ہُوا ہے۔ کہ حافظ حسن دین تُم دریائے راوی پہ جاؤ اور وہاں چلّہ کاٹو ــــ چلّہ کاٹو ــــ وہاں تُم اپنے معمول سے بات کرسکو گے۔"

ظفر شاہ، حافظ کو ٹیکسی میں دریائے راوی پر لے گیا۔ وہاں حافظ چھیالیس گھنٹے معلوم

نہیں کیا کچھ پڑھتا رہا۔ اس کے بعد اُس نے ایسی آواز میں جو اُس کی اپنی نہیں تھی کہا ــــ ظفر شاہ سے تین سو رُوپیہ اور لو ــــ اپنے بھائی کی آنکھوں کا علاج کرو ــــ تم اتنے غافل کیوں ہو ــــ اگر تم نے علاج نہ کرایا تو وہ بھی تمہاری طرح اندھا ہو جائے گا۔

ظفر شاہ نے تین سو رُوپے اور دیدیئے۔ حافظ حسن دین نے اپنی بے نُور آنکھیں گھمائیں جن میں مسرت کی جھلک نظر آسکتی تھی۔ اور کہا "ڈاک خانے میں میرے بارہ سو رُوپے جمع ہیں ــــ تم کچھ فکر نہ کرو ــــ پہلے پانچ سو اور یہ تین سو ــــ کل آٹھ سو ہوئے ــــ میں تمہیں ادا کر دوں گا"

ظفر شاہ بہت متاثر ہُوا "جی نہیں ــــ ادائیگی کی کیا ضرورت ہے ــــ آپ کی خدمت کرنا میرا فرض ہے"

ظفر شاہ دیر تک حافظ کی خدمت کرتا رہا۔ اس کے عوض چالیس دن کا چلّہ کاٹا، مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہُوا۔

ظفر شاہ نے ویسے کئی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ پُورا سیّد بن گیا ہے اور اس کی تطہیر ہو گئی ہے۔ مگر بعد میں اُس کو مایُوسی ہُوئی۔ کیونکہ وہ اپنے میں کوئی فرق نہ دیکھتا۔ اُس کی تشفی نہیں ہوتی تھی۔

اُس نے سمجھا کہ شاید اس نے حافظ صاحب کی خدمت پُوری طرح ادا نہیں کی جس کی وجہ سے اُس کی امید بر نہیں آئی۔ چنانچہ اُس نے حافظ صاحب کو روزانہ ایک مُرغ کھلانا شروع کر دیا۔ باداموں کی تعداد بڑھا دی۔ دُودھ کی مقدار بھی زیادہ کر دی۔

ایک دن اُس نے حافظ صاحب سے کہا "پیر صاحب ــــ میرے حال پر کرم فرمایئے ــــ میری مُراد کبھی تو پُوری ہو گی یا نہیں"

حافظ حسن دین نے بڑے پیرانہ انداز میں جواب دیا "ہو گی ــــ ضرور ہو گی ــــ ہم اتنے چلّے کاٹ چکے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالےٰ تم سے ناراض

ہیں ـــــ تم نے ضرور اپنی زندگی میں کوئی گناہ کیا ہوگا۔"

ظفر شاہ نے کچھ دیر سوچا۔" حضور ـــــ میں نے ـــــ ایسا کوئی گناہ نہیں کیا" جو"

حافظ صاحب نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔" نہیں ضرور کیا ہوگا ـــــ ذرا سوچو۔"

ظفر شاہ نے کچھ دیر سوچا۔" ایک مرتبہ میں نے اپنے والد صاحب کے بٹوے سے آٹھ آنے چرائے تھے۔"

" یہ کوئی اتنا بڑا گناہ نہیں ـــــ اور سوچو ـــــ کبھی تم نے کسی لڑکی کو بُری نگاہوں سے دیکھا تھا"؟

ظفر شاہ نے ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔" ہاں، پیر و مُرشد ـــــ صرف ایک مرتبہ۔"

" کون تھی وہ لڑکی؟"

" جی میرے چچا کی۔"

" کہاں رہتی ہے؟"

" جی اِسی گھر میں۔"

حافظ صاحب نے حکم دیا۔" بلاؤ اس کو ـــــ کیا تم اُس سے شادی چاہتے ہو؟"

" جی ہاں ـــــ ہماری منگنی قریب طے ہو چکی ہے۔"

حافظ صاحب نے بڑے پُر جلال لہجے میں کہا۔" ظفر شاہ ـــــ بلاؤ اس کو ـــــ تم نے مجھ سے پہلے ہی یہ بات کہہ دی ہوتی تو مجھے بیکار اتنا وقت ضائع نہ کرنا پڑتا۔"

ظفر شاہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ حافظ صاحب کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا۔ اور پھر اپنی ہونے والی منگیتر سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ حافظ صاحب سے ملے ـــــ بادلِ نخواستہ اُوپر گیا۔ بلقیس بیٹھی ناول پڑھ رہی تھی۔ ظفر شاہ کو دیکھ کر وہ ذرا سمٹ گئی اور کہا۔" آپ آج میرے کمرے میں کیسے آ گئے۔"

ظفر شاہ نے دبے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔" وہ ـــــ وہ حافظ صاحب آئے ہوئے

ہیں نا ــــ"

بلقیس نے ناول ایک طرف رکھ دیا" ہاں، ہاں ـــــ میں نے انہیں کئی مرتبہ دیکھا ہے ـــــ کیا بات ہے"

"بات یہ ہے کہ تُم سے ملنا چاہتے ہیں"

بلقیس نے حیرت کا اظہار کیا" وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں ـــــ اُن کی تو آنکھیں ہی نہیں"

"وہ تُم سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں ـــــ بڑے صاحبِ کشف بزرگ ہیں ـــــ اُن کی برکت سے ممکن ہے ہم دونوں کا بھلا ہو جائے"

بلقیس مُسکرائی" معلوم نہیں ـــــ آپ اتنے ضعیف الاعتقاد کیوں ہیں ـــــ لیکن چلیئے ـــــ اندھا ہی تو ہے ـــــ اُس سے کیا پردہ ہے"

بلقیس ظفر شاہ کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں گئی۔ حافظ حسن دین بیٹھا چلغوزے کھا رہا تھا۔ جب اُس نے قدموں کی چاپ سُنی تو بولا" آگئے ظفر شاہ"

ظفر شاہ نے تعظیماً جواب دیا" جی ہاں حضور"

"لڑکی آئی ہے؟"

"جی ہاں"

حافظ صاحب نے اپنی بے نُور آنکھوں سے بلقیس کو دیکھنے کی کوشش کی اور کہا۔ "بیٹھ جاؤ میرے سامنے" ـــــ بلقیس سامنے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

حافظ صاحب نے ظفر شاہ سے کہا" اب تمہاری مُراد بر آئے گی ـــــ ہم اس لڑکی کو وظیفہ بتائیں گے ـــــ انشاءاللہ سب کام ٹھیک ہو جائیں گے"

ظفر شاہ بہت خوش ہُوا ـــــ اُس نے فوراً پھل منگوائے اور بلقیس سے کہا ـــــ حافظ صاحب معلوم نہیں کتنی دیر لگائیں ـــــ ان کی خدمت کرنا نہ بھولنا"

حافظ صاحب نے کہا۔ "دیکھو ــــ ہم تُم سے بہت خُوش ہیں۔ آج ہماری طبیعت چاہتی ہے کہ تمہیں بھی خُوش کر دیں ــــ جاؤ بازار سے چار تولے نوشادر، ایک تولہ چُونا، دس تولے شنگرف اور ایک مٹّی کا کوزا لے آؤ ــــ جتنا اس کا وزن ہے اتنا ہی سونا بن جائے گا۔"

ظفر شاہ بھاگا بھاگا بازار گیا۔ اور یہ چیزیں لے آیا۔ جب اپنے وہائٹ ہاؤس میں پہونچا تو کواڑ کھُلے تھے اور اُس میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اُوپر گیا تو معلُوم ہُوا کہ بی بی بلقیس بھی نہیں ہے۔

(گُل خنداں' منٹو نمبر سے)

"ٹُوٹُو"

میں سوچ رہا تھا۔

دُنیا کی سب سے پہلی عورت جب ماں بنی تو کائنات کا ردِ عمل کیا تھا؟ دُنیا کے سب سے پہلے مرد نے کیا آسمان کی طرف تمتمائی آنکھوں سے دیکھ کر دُنیا کی سب سے پہلی زبان میں بڑے فخر کے ساتھ یہ نہیں کہا تھا "میں بھی خالق ہُوں"۔

ٹیلیفُون کی گھنٹی بجنا شُروع ہُوئی۔ میرے آوارہ خیالات کا سِلسلہ ٹُوٹ گیا۔ بالکنی سے اُٹھ کر میں اندر کمرے میں آیا۔ ٹیلیفُون ضدی بچے کی طرح چلّائے جا رہا تھا۔

ٹیلیفُون بڑی مفید چیز ہے، مگر مجھے نفرت ہے۔ اس لِئے کہ یہ وقت بے وقت بجنے لگتا ہے — چُنانچہ بہت ہی بددلی سے میں نے ریسیور اُٹھایا اور نمبر بتایا "فور فائو سیون"۔

دُوسرے سرے سے ہلو ہلو شروع ہُوئی۔ میں جھنجھلا گیا "کون ہے"۔

جواب ملا "آیا"۔

میں نے آیاؤں کے طرزِ گفتگو میں پُوچھا "کِس کو مانگتا ہے؟"

"میم صاحب ہے؟"

"ہے ـــــ ٹھہرو۔"

ٹیلیفون کا رسیور ایک طرف رکھ کر میں نے اپنی بیوی کو جو غالباً اندر سو رہی تھی آواز دی

"میم صاحب ـــــ میم صاحب۔"

آواز سُن کر میری بیوی اُٹھی اور جمائیاں لیتی ہُوئی آئی" یہ کیا مذاق ہے ـــــ میم صاحب، میم صاحب"!

میں نے مسکرا کر کہا " میم صاحب ٹھیک ہے ـــــ یاد ہے، تم نے اپنی پہلی آیا سے کہا تھا کہ مجھے میم صاحب کے بدلے بیگم صاحبہ کہا کرو تو اس نے بیگم صاحبہ کو بینگن صاحبہ بنا دیا تھا"!

ایک مُسکراتی ہُوئی جمائی لے کر میری بیوی نے پُوچھا" کون ہے۔"

" دریافت کرلو۔"

میری بیوی نے ٹیلیفون اُٹھایا اور ہلو ہلو شروع کر دیا ـــــ میں باہر بالکنی میں چلا گیا ـــــ عورتیں ٹیلیفون کے معاملے میں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ چنانچہ پندرہ بیس منٹ تک ہلو ہلو ہوتا رہا۔

میں سوچ رہا تھا۔

ٹیلیفون پر ہر دو تین الفاظ کے بعد ہلو کیوں کہا جاتا ہے؟

کیا اس ہلو ہلو کے عقب میں احساس کمتری تو نہیں؟ ـــــ بار بار ہلو صرف اسے کرنی چاہیئے جسے اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کی مہمل گفتگو سے تنگ آ کر سننے والا ٹیلیفون چھوڑ دے گا ـــــ یا ہو سکتا ہے یہ محض عادت ہو۔

دفعتاً میری بیوی گھبرائی ہُوئی آئی " سعادت صاحب، اس دفعہ معاملہ بہت ہی سیریس معلُوم ہوتا ہے۔"

" کون سا معاملہ؟"

معاملے کی نوعیت بتائے بغیر میری بیوی نے کہنا شروع کر دیا" بات بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ گئی ہے ـــــ پاگل پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ـــــ میں شرط لگانے کے لئے تیار ہوں کہ بات کچھ بھی نہیں ہو گی۔ بس پھُسری کا بھگندر بنا ہو گا ـــــ دونو سر پھرے ہیں"

"اجی حضرت کون؟"

میں نے بتایا نہیں آپ کو؟ ـــــ اوہ ـــــ ٹیلیفون، طاہرہ کا تھا!"

"طاہرہ ـــــ کون طاہرہ؟"

"مسز یزدانی"

"اوہ!" میں سارا معاملہ سمجھ گیا" کوئی نیا جھگڑا ہوا ہے؟"

"نیا اور بہت بڑا ـــــ جائیے یزدانی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں"

"مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟"

"معلوم نہیں ـــــ طاہرہ سے ٹیلیفون چھین کر مجھ سے فقط یہ کہا" بھابی جان، ذرا منٹو صاحب کو بلایئے!"

"خواہ مخواہ میرا مغز چاٹے گا" یہ کہہ کر میں اُٹھا اور ٹیلیفون پر یزدانی سے مخاطب ہوا۔ اس نے صرف اتنا کہا" معاملہ بے حد نازک ہو گیا ہے ـــــ تم اور بھابی جان ٹیکسی میں فوراً یہاں آجاؤ"

میں اور میری بیوی جلدی کپڑے تبدیل کر کے یزدانی کی طرف روانہ ہو گئے راستے میں ہم دونوں نے یزدانی اور طاہرہ کے متعلق بے شمار باتیں کیں۔

طاہرہ ایک مشہور عشق پیشہ موسیقار کی خوبصورت لڑکی تھی۔ عطا یزدانی ایک پٹھان آڑھتی کا لڑکا تھا۔ پہلے شاعری شروع کی، پھر ڈرامہ نگاری، اس کے بعد آہستہ آہستہ فلمی کہانیاں لکھنے لگا ـــــ طاہرہ کا باپ اپنے آٹھویں عشق میں مشغول تھا اور عطا یزدانی علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے لئے "بیلچہ" نامی ڈرامہ لکھنے میں ـــــ ایک شام پریڈ

کرتے ہوئے عطایز دانی کی آنکھیں طاہرہ کی آنکھوں سے چار ہوئیں ساری رات جاگ کر اس نے ایک خط لکھا اور طاہرہ تک پہنچا دیا ــــــ چند ماہ تک دونوں میں نامہ و پیام جاری رہا اور آخر کار دونوں کی شادی بغیر کسی حیل و حجت ہو گئی۔ عطایز دانی کو اس بات کا افسوس تھا کہ ان کا عشق ڈرامے سے محروم رہا۔

طاہرہ بھی طبعاً ڈرامہ پسند تھی ــــــ عشق اور شادی سے پہلے سہیلیوں کے ساتھ باہر شاپنگ کو جاتی تو ان کے لئے مصیبت بن جاتی ــــ گنجے آدمی کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں میں کھجلی شروع ہو جاتی "میں اس کے سر پر ایک دھول تو ضرور جماؤں گی، چاہے تم کچھ ہی کرو"

ذہین تھی ــــــ ایک دفعہ اس کے پاس کوئی پیٹی کوٹ نہیں تھا۔ اس نے کمر کے گرد ازار بند باندھا اور اس میں ساڑھی اڑس کر سہیلیوں کے ساتھ چل دی۔

کیا طاہرہ واقعی عطایز دانی کے عشق میں مبتلا ہوئی تھی؟ اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یزدانی کا پہلا عشقیہ خط ملنے پر اس کا ردِ عمل غالباً یہ تھا کہ دلچسپ کھیل ہے کیا ہرج ہے، کھیل لیا جائے۔ شادی پر بھی اس کا ردِ عمل کچھ اسی قسم تھا۔ یوں تو مضبوط کردار کی لڑکی تھی، یعنی جہاں تک باعصمت ہونے کا تعلق ہے، لیکن کھلنڈری اور یہ جو آئے دن اس کا اپنے شوہر کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوتا تھا، میں سمجھتا ہوں ایک کھیل ہی تھا، لیکن جب ہم وہاں پہنچے اور حالات دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ کھیل بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی وہ شور برپا ہوا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ طاہرہ اور یزدانی دونوں اونچے اونچے سروں میں بولنے لگے، شکوے، طعنے مہنے ــــــ پرانے مُردوں پر نئی لاشیں، نئی لاشوں پر پرانے مُردے ــــــ جب دونوں تھک گئے تو آہستہ آہستہ لڑائی کی نوک پلک نکلنے لگی۔

طاہرہ کو شکایت تھی کہ عطا اسٹڈیو کی ایک واہیات ایکٹرس کو ٹیکسیوں میں لئے لئے پھرتا ہے۔

یزدانی کا بیان تھا کہ یہ سراسر بہتان ہے۔

طاہرہ قرآن اٹھانے کے لیے تیار تھی کہ عطا کا اس ایکٹرس سے ناجائز تعلق ہے جب وہ صاف انکاری ہُوا تو طاہرہ نے بڑی تیزی کے ساتھ کہا "کتنے پارسا بنتے ہو ــــ یہ آیا جو کھڑی ہے۔ کیا تم نے اسے چومنے کی کوشش نہیں کی تھی ..... وہ تو میں اُوپر سے آگئی ......"

یزدانی گرجا "بکواس بند کرو"

اس کے بعد پھر وہی شور برپا ہوگیا۔

میں نے سمجھایا۔ میری بیوی نے سمجھایا مگر کوئی اثر نہ ہُوا۔ عطا کو تو میں نے ڈانٹا بھی "زیادتی سراسر تمہاری ہے ــــ معافی مانگو اور یہ قصہ ختم کرو"

عطا نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ میری طرف دیکھا "سعادت، یہ قصہ یُوں ختم نہیں ہوگا ــــ میرے متعلق یہ عورت بہت کچھ کہہ چکی ہے، لیکن میں نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکالا ــــ عنایت کو جانتے ہو تم؟"

"عنایت؟"

"نیلے بیگ سنگر ــــ اس کے باپ کا شاگرد!"

"ہاں ہاں"

"اوّل درجے کا چھٹا ہُوا بدمعاش ہے ــــ مگر یہ عورت ہر روز اسے یہاں بلاتی ہے ــــ بہانہ یہ ہے کہ ....."

طاہرہ نے اس کی بات کاٹ دی "بہانہ وہانہ کچھ نہیں ــــ ہو، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

عطا نے انتہائی نفرت کے ساتھ کہا "کچھ نہیں"

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر بالوں کی جھالر ایک طرف ہٹائی "عنایت میرا چاہنے والا ہے ——— بس!"

عطا نے گالی دی ——— عنایت کو موٹی اور طاہرہ کو چھوٹی ——— پھر شور برپا ہو گیا۔

ایک بار پھر وہی کچھ دہرایا گیا جو پہلے کئی بار کہا جا چکا تھا ——— میں نے اور میری بیوی نے بہت ثالثی کی مگر نتیجہ وہی صفر۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے عطا اور طاہرہ دونوں اپنے جھگڑے سے مطمئن نہیں۔ لڑائی کے شعلے ایک دم بھڑکتے اور کوئی مرئی نتیجہ پیدا کئے بغیر ٹھنڈے ہو جاتے۔ پھر بھڑکائے جاتے تھے، لیکن ہوتا ہواتا کچھ نہیں تھا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ عطا اور طاہرہ چاہتے کیا ہیں مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا ——— مجھے بڑی اُلجھن ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے سے بک بک اور جھک جھک جاری تھی، لیکن انجام خدا معلوم کہاں بھٹک رہا تھا۔ تنگ آکر میں نے کہا "بھئی، اگر تم دونوں کی آپس میں نہیں نبھ سکتی تو بہتر یہی ہے کہ علیحدہ ہو جاؤ۔"

طاہرہ خاموش رہی، لیکن عطا نے چند لمحات غور کرنے کے بعد کہا "علیحدگی نہیں ——— طلاق!"

طاہرہ چلّائی "طلاق، طلاق، طلاق ——— دیتے کیوں نہیں طلاق ——— میں کب تمہارے پاؤں پڑی ہوں کہ طلاق نہ دو۔"

عطا نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا "دے دوں گا اور بہت جلد۔"

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر سے بالوں کی جھالر ایک طرف ہٹائی "آج ہی دو۔"

عطا اُٹھ کر ٹیلیفون کی طرف بڑھا "میں قاضی سے بات کرتا ہوں۔"

جب میں نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے تو اُٹھ کر عطا کو روکا "بے وقوف نہ بنو بیٹھو آرام سے!"

طاہرہ نے کہا "نہیں بھائی جان، آپ مت روکئے۔"

میری بیوی نے طاہرہ کو ڈانٹا" بکو اس بند کرو۔"

"یہ بکو اس صرف طلاق ہی سے بند ہوگی۔" یہ کہہ کر طاہرہ ٹانگ ہلانے لگی۔

"سن لیا تم نے" عطا مجھ سے مخاطب ہو کر پھر ٹیلیفون کی طرف بڑھا، لیکن میں درمیان میں کھڑا ہو گیا۔

طاہرہ میری بیوی سے مخاطب ہوئی۔ "مجھے طلاق دے کر اس چڈو ایکٹرس سے بیاہ رچائے گا۔"

عطا نے طاہرہ سے پوچھا۔ "اور تو؟"

طاہرہ نے ماتھے پر بالوں کے پسینے میں بھیگی ہوئی جھالر ہاتھ سے اوپر کی۔ "میں ——— تمہارے اس یوسف ثانی عنایت خان سے!"

"بس اب پانی سر سے گزر چکا ہے ——— حد ہو گئی ہے ——— تم ہٹ جاؤ ایک طرف"
عطا نے ڈائرکٹری اور نمبر دیکھنے لگا۔ جب وہ ٹیلیفون کرنے لگا تو میں نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ڈائل کیا، لیکن نمبر نہ ملا مجھے موقعہ ملا تو میں نے اسے پُر زور الفاظ میں کہا کہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ میری بیوی نے بھی اس سے درخواست کی مگر وہ نہ مانا۔ اس پر طاہرہ نے کہا۔ "صفیہ" تم کچھ نہ کہو ——— اس آدمی کے پہلو میں دل نہیں، پتھر ہے ——— میں تمہیں وہ خط دکھاؤں گی جو شادی سے پہلے اس نے مجھے لکھے تھے ——— اس وقت میں اس کے دل کا قرار اس کی آنکھوں کا نور تھی میری زبان سے نکلا ہوا صرف ایک لفظ اس کے تنِ مُردہ میں جان ڈالنے کے کافی تھا ——— میرے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھ کر یہ بخوشی مرنے کے لئے تیار تھا ——— لیکن آج اسے میری ذرہ برابر پروا نہیں۔"

عطا نے ایک بار پھر نمبر ملانے کی کوشش کی۔

طاہرہ بولتی رہی۔ "میرے باپ کی موسیقی سے بھی اسے عشق تھا ——— اس کو فخر تھا کہ اتنا بڑا آرٹسٹ مجھے اپنی دامادی میں قبول کر رہا ہے ——— شادی کی منظوری حاصل کرنے

کے لئے اس نے ان کے پاؤں تک دابے، پر آج اسے ان کا کوئی خیال نہیں۔"

عطا ڈائل گھماتا رہا۔

طاہرہ مجھ سے مخاطب ہوئی "آپ کو یہ بھائی کہتا ہے، آپ کی عزت کرتا ہے ۔۔۔ کہتا تھا جو کچھ بھائی جان کہیں گے میں مانوں گا لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں ٹیلیفون کر رہا ہے قاضی کو ۔۔۔ مجھے طلاق دینے کے لئے۔"

میں نے ٹیلیفون ایک طرف ہٹایا "عطا، اب چھوڑو بھی۔"

"نہیں" یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

طاہرہ بولی "جانے دیجئے بھائی جان ۔۔۔ اس کے دل میں میرا کیا، ٹوٹو کا بھی کچھ خیال نہیں!"

عطا تیزی سے پلٹا "نام نہ لو ٹوٹو کا!"

طاہرہ نے نتھنے پھلا کر کہا "کیوں نام نہ لوں اس کا۔"

عطا نے ریسیور رکھ دیا "وہ میرا ہے!"

طاہرہ اٹھ کھڑی ہوئی "جب میں تمہاری نہیں ہوں تو وہ کیسے تمہارا ہو سکتا ہے۔ تم تو اس کا نام بھی نہیں لے سکتے۔"

عطا نے کچھ دیر سوچا "میں سب بندوبست کر لوں گا۔"

طاہرہ کے چہرے پر ایک دم زردی چھا گئی "ٹوٹو کو چھین لو گے مجھ سے؟"

عطا نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا "ہاں۔"

"ظالم"

طاہرہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ بے ہوش ہو کر گرنے ہی والی تھی کہ میری بیوی نے اسے تھام لیا ۔۔۔ عطا پریشان ہو گیا۔ پانی کے چھینٹے۔ یوڈی کلون۔ سملنگ سالٹ۔ ڈاکٹروں کو ٹیلیفون ۔۔۔ اپنے بال نوچ ڈالے۔ قمیص پھاڑ ڈالی ۔۔۔ طاہرہ ہوش میں آئی تو

وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپکنے لگا۔ "جانم ٹوٹو تمہارا ہے ــــ ٹوٹو تمہارا ہے۔"

طاہرہ نے رونا شروع کر دیا۔ "نہیں وہ تمہارا ہے۔"

عطا نے طاہرہ کی آنسوؤں بھری آنکھوں کو چومنا شروع کر دیا۔ "میں تمہارا ہوں۔ تم میری ہو ــــ ٹوٹو تمہارا بھی ہے، میرا بھی ہے!"

میں نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکلی تو میں بھی تھوڑی دیر کے بعد چل دیا ــــ ٹیکسی کھڑی تھی، ہم دونو بیٹھ گئے ــــ میری بیوی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ ٹوٹو کون ہے؟"

میری بیوی کھکھلا کر ہنس پڑی۔ "ان کا لڑکا۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "لڑکا؟"

میری بیوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے اور زیادہ حیرت سے پوچھا "کب پیدا ہوا تھا ــــ میرا مطلب ہے......"

"ابھی پیدا نہیں ہوا ــــ چوتھے مہینے میں ہے۔"

چوتھے مہینے، یعنی اس واقعے کے چار مہینے بعد، میں باہر بالکنی میں بالکل خالی الذہن بیٹھا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ بڑی بے دلی سے اٹھنے کو تھا کہ آواز بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری بیوی آئی۔ میں نے اس سے پوچھا "کون تھا؟"

"یزدانی صاحب"

"کوئی نئی لڑائی تھی؟"

"نہیں ــــ طاہرہ کے لڑکی ہوئی ہے ــــ مری ہوئی۔" یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی اندر چلی گئی۔

میں سوچنے لگا۔ "اگر اب طاہرہ اور عطا کا جھگڑا ہوا تو اسے کون ٹوٹو چکائے گا؟"

(خالی بوتلیں خالی ڈبے، سے)

"اشتراکی ادیب باری، میرا دوست، میرا رہنما، تمام عُمر اپنی زندگی کی جلی اور خفی سُرخیاں جماتا رہا۔ لیکن افسوس کہ وہ اُن کے نیچے وُہ مضموُن نہ لکھ سکا، جو اس کے وزنی سر میں پرورش پاتے تھے اور بھاپ بن کر لاہور کی بیکریوں اور ہوٹلوں کی کثیف فضا میں جذب ہو جاتے تھے۔"

(گنجے فرشتے)

ممّد بھائی

فارس روڈ سے آپ اس طرف گلی میں چلے جائیے جو سفید گلی کہلاتی ہے تو اس کے آخری سرے پر آپ کو چند ہوٹل ملیں گے۔ یُوں تو بمبئی میں قدم قدم پر ہوٹل اور ریستوران ہوتے ہیں مگر یہ ریستوران اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور منفرد ہیں کہ یہ اس علاقے میں واقع ہیں جہاں بھانت بھانت کی رنڈیاں بستی ہیں۔

ایک زمانہ گذر چکا ہے۔ بس آپ یہی سمجھئے کہ بیس برس کے قریب، جب میں ان ریستورانوں میں چائے پیا کرتا تھا اور کھانا کھایا کرتا تھا۔ سفید گلی سے آگے نکل کر "پلے ہاؤس" آتا ہے۔ اِدھر دن بھر ہاؤ ہو رہتی ہے۔ سینما کے شو دن بھر چلتے رہتے تھے۔ چمپیاں ہوتی تھیں۔ سینما گھر غالباً چار تھے۔ ان کے باہر گھنٹیاں بجا بجا کر بڑے سماعت پاش طریقے پر لوگوں کو مدعو کرتے تھے۔

"آؤ آؤ — دو آنے میں — فسٹ کلاس کھیل — دو آنے میں!"

بعض اوقات یہ گھنٹیاں بجانے والے زبردستی لوگوں کو اندر دھکیل دیتے تھے۔ باہر کرسیوں پر چمپی کرانے والے بیٹھے ہوئے تھے جن کی کھوپڑیوں کی مرمت بڑے سائنٹیفک طریقے پر کی جاتی تھی۔ مالش اچھی چیز ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بمبئی کے رہنے والے اس کے اتنے گرویدہ کیوں ہیں۔ دِن کو اور رات کو ہر وقت اُنہیں تیل مالش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

آپ اگر چاہیں تو رات کے تین بجے بڑی آسانی سے تیل مالشیا بلا سکتے ہیں۔ یُوں بھی ساری رات آپ خواہ بمبئی کے کسی کونے میں ہوں، یہ آواز آپ یقیناً سنتے رہیں گے "پی ۔ پی ۔ پی"۔ یہ 'پی' چمپی کا مخفف ہے۔

فارس روڈ یُوں تو ایک سڑک کا نام ہے۔ لیکن در اصل یہ اس پُورے علاقے سے منسُوب ہے جہاں ہیوائیں بستی ہیں، یہ بہت بڑا علاقہ ہے۔ اس میں کئی گلیاں ہیں، جن کے مختلف نام ہیں۔ لیکن سہُولت کے طور پر اس کی ہر گلی کو فارس روڈ یا سفید گلی کہا جاتا ہے۔ اس میں سینکڑوں جنگلہ لگی دکانیں ہیں۔ جن میں مختلف رنگ و سن کی عورتیں بیٹھ کر اپنا جسم بیچتی ہیں۔ مختلف داموں پر، آٹھ سے آٹھ روپے تک، آٹھ رُوپے سے سو رُوپے تک ــــ ہر دام کی عورت آپ کو اس علاقے میں مل سکتی ہے۔

یہودی، پنجابی، مرہٹی، کشمیری، گجُراتی، بنگالی، اینگلو انڈین، فرانسیسی، چینی، جاپانی غرضیکہ ہر قسم کی عورت آپ کو یہاں سے دستیاب ہو سکتی ہے ــــ یہ عورتیں کیسی ہوتی ہیں ــــ معاف کیجئے گا، اس کے متعلق آپ مجُھ سے کچُھ نہ پوچھئے ــــ بس عورتیں ہوتی ہیں ــــ اور ان کو گاہک مل ہی جاتے ہیں۔

اس علاقے میں بہت سے چینی بھی آباد ہیں۔ معلُوم نہیں یہ کیا کاروبار کرتے ہیں۔ مگر رہتے اسی علاقے میں ہیں۔ بعض تو ریستوران چلاتے ہیں جن کے باہر بورڈوں پر اُوپر نیچے کیڑے مکوڑوں کی شکل میں کچُھ لکھا ہوتا ہے ــــ معلوم نہیں کیا ــــ

اس علاقے میں بزنس مین اور ہر قسم کے لوگ آباد ہیں۔ ایک گلی ہے جس کا نام عرب لین ہے۔ وہاں کے لوگ اسے عرب گلی کہتے ہیں۔ اس زمانے میں جس کی میں بات کر رہا ہُوں۔ اس گلی میں غالباً بیس پچیس عرب رہتے تھے جو خُود کو موتیوں کے بیوپاری کہتے تھے۔ باقی آبادی پنجابیوں اور رام پوریوں پر مشتمل تھی۔

اس گلی میں مجُھے ایک کمرہ مل گیا تھا۔ جس میں سُورج کی رَوشنی کا داخلہ بند تھا۔ ہر وقت

بجلی کا بلب روشن رہتا تھا۔ اس کا کرایہ ساڑھے نو روپے ماہوار تھا۔

آپ کا اگر بمبئی میں قیام نہیں رہا۔ تو شاید آپ مشکل سے یقین کریں گے کہ وہاں کسی کو کسی اور سے سروکار نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی کھولی میں مر رہے ہیں تو آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ آپ کے پڑوس میں قتل ہو جائے، مجال ہے جو آپ کو اس کی خبر ہو جاتے۔ مگر وہاں عرب گلی میں صرف ایک شخص ایسا تھا جس کو اڑوس پڑوس کے ہر شخص سے دلچسپی تھی۔ اور اس کا نام ممّد بھائی تھا۔

ممد بھائی رام پور کا رہنے والا تھا۔ اول درجے کا پھکیت، گتکے اور بنوٹ کے فن میں یکتا۔ میں جب عرب گلی میں آیا تو ہوٹلوں میں اس کا نام اکثر سننے میں آیا۔ لیکن ایک عرصے تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔

میں صبح سویرے اپنی کھولی سے نکل جاتا تھا اور بہت رات گئے لوٹتا تھا۔ لیکن مجھے ممد بھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ کیونکہ اس کے متعلق عرب گلی میں بے شمار داستانیں مشہور تھیں۔ کہ بیس پچیس آدمی اگر لاٹھیوں سے مسلح ہو کر اس پر ٹوٹ پڑیں تو وہ اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ سب کو چت کر دیتا ہے۔ اور یہ کہ اس جیسا چھری مار ساری بمبئی میں نہیں مل سکتا۔ ایسے چھری مارتا ہے کہ جس کے لگتی ہے اسے پتہ بھی نہیں چلتا سو قدم بغیر احساس کے چلتا رہتا ہے اور آخر ایک دم ڈھیر ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کے ہاتھ کی صفائی ہے۔

اس کے ہاتھ کی یہ صفائی دیکھنے کا مجھے اشتیاق نہیں تھا لیکن یوں اس کے متعلق اور باتیں سن سن کر میرے دل میں خواہش ضرور پیدا ہو چکی تھی۔ کہ میں اسے دیکھوں۔ اس سے باتیں نہ کروں لیکن قریب سے دیکھ لوں کہ وہ کیسا ہے۔ اس تمام علاقے پر اس کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ بہت بڑا دادا یعنی بدمعاش تھا۔ لیکن اس کے باوجود لوگ کہتے تھے کہ اس نے کسی کی بہو بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ لنگوٹ کا بہت پکا ہے۔ غریبوں کے

دکھ درد کا شریک ہے۔ عرب گلی ـــــ صرف عرب گلی ہی نہیں، آس پاس جتنی گلیاں تھیں۔ ان میں جتنی نادار عورتیں تھیں، سب ممد بھائی کو جانتی تھیں۔ کیونکہ وہ اکثر ان کی مالی امداد کرتا رہتا تھا۔ لیکن وہ خود ان کے پاس کبھی نہیں جاتا تھا۔ اور اپنے کسی خورد سال شاگرد کو بھیج دیتا تھا۔ اور ان کی خیریت دریافت کر لیا کرتا تھا۔

مجھے معلوم نہیں اس کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے۔ اچھا کھاتا تھا، اچھا پہنتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا تانگہ تھا۔ جس میں بڑا تندرست ٹٹو جتا ہوتا تھا۔ اس کو وہ خود چلاتا تھا۔ ساتھ دو یا تین شاگرد ہوتے تھے، بڑے باادب ـــــ بھنڈی بازار کا ایک چکر لگا کر یا کسی درگاہ میں ہو کر وہ تانگے پر واپس عرب گلی آجاتا تھا اور کسی ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں کے ساتھ گتکے اور بنوٹ کی باتوں میں مصروف ہو جاتا تھا۔

میری کھولی کے ساتھ ہی ایک اور کھولی تھی جس میں مارواڑ کا ایک مسلمان رقاص رہتا تھا۔ اس نے مجھے ممد بھائی کی سینکڑوں کہانیاں سنائیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ ممد بھائی ایک لاکھ روپے کا آدمی ہے۔ اس کو ایک مرتبہ ہیضہ ہو گیا تھا۔ ممد بھائی کو پتہ چلا تو اس نے فارس روڈ کے تمام ڈاکٹر اس کی کھولی میں اکٹھے کر دیئے اور ان سے کہا "دیکھو اگر عاشق حسین کو کچھ ہو گیا تو میں سب کا صفایا کر دوں گا۔" عاشق حسین نے بڑے عقیدت مندانہ لہجے میں مجھ سے کہا "منٹو صاحب! ممد بھائی فرشتہ ہے ـــــ فرشتہ" ـــــ جب اس نے ڈاکٹروں کو دھمکی دی تو وہ سب کانپنے لگے۔ ایسا لگ کے علاج کیا کہ میں دو دن میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔

ممد بھائی کے متعلق میں عرب گلی کے گندے اور واہیات ریستورانوں میں اور بھی بہت کچھ سن چکا تھا۔ ایک شخص نے جو غالباً اس کا شاگرد تھا اور خود کو بہت بڑا پھکیت سمجھتا تھا، مجھ سے یہ کہا تھا کہ ممد دادا اپنے نیفے میں ایک ایسا آبدار خنجر ہمیشہ اڑس کے رکھتا ہے جو استرے کی طرح شیو بھی کر سکتا ہے اور یہ خنجر نیام میں نہیں ہوتا۔ کھلا رہتا ہے۔ بالکل ننگا اور وہ بھی اس کے پیٹ کے ساتھ۔ اس کی نوک اتنی تیکھی ہے کہ اگر باتیں کرتے ہوئے جھکتے

ہوئے اس سے ذراسی غلطی ہو جائے تو ممد بھائی کا ایک دم کام تمام ہو کے رہ جائے۔

ظاہر ہے کہ اس کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا اشتیاق دن بدن میرے دل و دماغ میں بڑھتا گیا۔ معلوم نہیں میں نے اپنے تصور میں اس کی شکل و صورت کا کیا نقشہ تیار کیا تھا۔ بہرحال اتنی مدت کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ایک قوی ہیکل انسان کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا تھا جس کا نام ممد بھائی تھا۔ اس قسم کا آدمی جو ہرکولیس سائیکلوں پر اشتہار کے طور پر دیا جاتا ہے۔

میں صبح سویرے اپنے کام پر نکل جاتا تھا اور رات کو دس بجے کے قریب کھانے وانے سے فارغ ہو کر واپس آ کر فوراً سو جاتا تھا۔ اس دوران میں ممد بھائی سے کیسے ملاقات ہو سکتی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ کام پر نہ جاؤں۔ اور سارا دن عرب گلی میں گذار کر ممد بھائی کو دیکھنے کی کوشش کروں، مگر افسوس کہ میں ایسا نہ کر سکا۔ اس لئے کہ میری ملازمت ہی بڑی واہیات قسم کی تھی۔

ممد بھائی سے ملاقات کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک انفلوئنزا نے مجھ پر زبردست حملہ کیا۔ ایسا حملہ کہ میں بوکھلا گیا۔ خطرہ تھا کہ یہ بگڑ کر نمونیا میں تبدیل ہو جائے گا۔ کیونکہ عرب گلی کے ایک ڈاکٹر نے یہی کہا تھا۔ میں بالکل تن تنہا تھا۔ میرے ساتھ جو ایک آدمی رہتا تھا اس کو پونہ میں نوکری مل گئی تھی، اس لئے اس کی رفاقت بھی نصیب نہیں تھی۔ میں بخار میں پھنکا جا رہا تھا۔ اس قدر پیاس تھی کہ جو پانی کھولی میں رکھا تھا وہ میرے لئے ناکافی تھا اور دوست یار کوئی پاس نہیں تھا۔ جو میری دیکھ بھال کرتا۔

میں بہت سخت جان ہوں، دیکھ بھال کی مجھے عموماً ضرورت محسوس نہیں ہوا کرتی۔ مگر معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کا بخار تھا۔ انفلوئنزا تھا، ملیریا تھا یا اور کیا تھا۔ لیکن اس نے میری ریڑھ کی ہڈی توڑ دی۔ میں بلبلانے لگا۔ میرے دل میں پہلی مرتبہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے پاس کوئی ہو جو مجھے دلاسہ دے۔ دلاسہ نہ دے تو کم از کم ایک سیکنڈ کے لئے اپنی شکل دکھا کے چلا جائے تاکہ

مجھے یہ خوشگوار احساس ہو کہ مجھے پوچھنے والا بھی کوئی ہے۔

دو دن تک میں بستر میں پڑا تکلیف بھری کروٹیں لیتا رہا، مگر کوئی نہ آیا ــــ آنا بھی کیسے تھا ــــ میری جان پہچان کے آدمی ہی کتنے تھے ــــ دو تین چار ــــ اور وہ اتنی دُور رہتے تھے کہ ان کو میری صحت کا علم بھی نہیں ہو سکتا تھا ــــ اور پھر وہاں بمبئی میں کون کس کو پُوچھتا ہے ــــ کوئی مرے یا جیئے ــــ ان کی بلا سے ــــ

میری بُری حالت تھی۔ عاشق حسین ڈانسر کی بیوی بیمار تھی اس لیئے وہ اپنے وطن جا چکا تھا۔ یہ مجھے ہوٹل کے چھوکرے نے بتایا تھا۔ اب میں کس کو بلاتا ــــ بڑی نڈھال حالت میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ خُود نیچے اُتروں اور کسی ڈاکٹر کے پاس جاؤں، کہ دروازے پر دستک ہُوئی۔ میں نے خیال کیا کہ ہوٹل کا چھوکرا جسے بمبئی کی زبان میں بَاہر والا کہتے ہیں ہوگا۔ بڑی مریل آواز میں کہا "آ جاؤ!"

دروازہ کھُلا اور ایک چھریرے بدن کا آدمی، جس کی مونچھیں مجھے سب سے پہلے دکھائی دیں، اندر داخل ہُوا۔

اس کی مونچھیں ہی سب کُچھ تھیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کی مُونچھیں نہ ہوتیں تو بہت ممکن ہے کہ وہ کُچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کی مونچھوں ہی نے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سارے وُجود کو زندگی بخش رکھی ہے۔

وہ اندر آیا اور اپنی قیصر ولیم جیسی مونچھوں کو ایک انگلی سے ٹھیک کرتے ہُوئے میری کھاٹ کے قریب آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تین چار آدمی تھے۔ عجیب و غریب وضع قطع کے۔ میں بہت حیران تھا کہ یہ کون ہیں اور میرے پاس کیوں آئے ہیں۔

قیصر ولیم جیسی مونچھوں اور چھریرے بدن والے آدمی نے مجھ سے بڑی نرم و نازک آواز میں کہا "منٹو صاحب! آپ نے حد کر دی۔ سالا مجھے اطلاع کیوں نہ دی"؟ منٹو کا منٹو بن جانا میرے لیئے کوئی نئی بات نہیں۔ اس کے علاوہ میں موڈ میں بھی نہیں تھا کہ میں

اس کی اصلاح کرتا۔ میں نے اپنی نحیف آواز میں اس کی مونچھوں سے صرف اتنا کہا: "آپ کون ہیں؟"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "ممد بھائی!"

میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "ممد بھائی ــــ تو ــــ تو آپ ممد بھائی ہیں ــــ مشہور دادا ــــ"

میں نے یہ کہہ تو دیا۔ لیکن فوراً مجھے اپنے بینڈے پن کا احساس ہُوا اور رُک گیا۔ ممد بھائی نے چھوٹی انگلی سے اپنی مونچھوں کے کرخت بال ذرا اوپر کئے اور مسکرایا۔ "ہاں منٹو بھائی ــ میں ممد ہُوں ــــ یہاں کا مشہور دادا ــــ مجھے باہر والے سے معلوم ہُوا کہ تم بیمار ہو ــــ سالا یہ بھی کوئی بات ہے کہ تم نے مجھے خبر نہ کی۔ ممد بھائی کا مستک پھر جاتا ہے جب کوئی ایسی بات ہوتی ہے۔"

میں جواب میں کُچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے مخاطب ہو کر کہا: "ارے ــــ کیا نام ہے تیرا ــــ جا بھاگ کے جا، اور کیا نام ہے اس ڈاکٹر کا ــــ سمجھ گئے نا، اس سے کہہ کہ ممد بھائی تجھے بلاتا ہے ــــ ایک دم جلدی آ ــــ ایک دم ــــ سب کام چھوڑ دے اور جلدی آ ــــ اور دیکھ، سالے سے کہنا، سب دوائیں لیتا آئے"

ممد بھائی نے جس کو حکم دیا تھا وہ ایک دم چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا ــــ وہ تمام داستانیں میرے بخار آلودہ دماغ میں چل پھر رہی تھیں جو میں اس کے متعلق لوگوں سے سُن چکا تھا ــــ لیکن گڈمڈ صورت میں، کیونکہ بار بار اس کو دیکھنے کی وجہ سے اس کی مونچھیں سب پر چھا جاتی تھیں۔ بڑی خوفناک، مگر بڑی خوبصورت مونچھیں تھیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس چہرے کو جس کے خدوخال بڑے ملائم اور نرم و نازک ہیں، صرف خوفناک بنانے کے لئے یہ مونچھیں رکھی گئی ہیں۔ میں نے اپنے بخار آلود دماغ میں سوچا کہ یہ شخص درحقیقت اتنا خوفناک نہیں جتنا کہ اس نے خود کو ظاہر کر رکھا ہے۔

کھولی میں کوئی کُرسی نہیں تھی۔ میں نے ممد بھائی سے کہا کہ وہ میری چارپائی پر بیٹھ جائے مگر اس نے انکار کر دیا اور بڑے روکھے سے لہجے میں کہا ــــ

"ٹھیک ہے ــــ ہم کھڑے رہیں گے"۔

پھر اس نے ٹہلتے ہوئے ــــ حالانکہ اس کھولی میں اس عیاشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی، کُرتے کا دامن اٹھا کر پائجامے کے نیفے سے ایک خنجر نکالا ــــ میں سمجھا چاندی کا ہے۔ اس قدر لشک رہا تھا کہ میں آپ سے کیا کہوں۔ یہ خنجر نکال کر پہلے اس نے اپنی کلائی پر پھیرا۔ جو بال اس کی زد میں آئے، سب صاف ہو گئے۔ اس نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور ناخن ترانشنے لگا۔ اس کی آمد ہی سے میرا بخار کئی درجے نیچے اُتر گیا تھا۔ میں نے اب کسی قدر ہوش مند حالت میں اس سے کہا: "ممد بھائی ــــ یہ چھُری تم اس طرح اپنے ..... نیفے میں ــــ یعنی بالکل اپنے پیٹ کے ساتھ رکھتے ہو ــــ اتنی تیز ہے کہ تمہیں خوف محسوس نہیں ہوتا؟"

ممد نے خنجر سے اپنے ناخن کی ایک قاش بڑی صفائی سے اڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"منٹو بھائی ــــ یہ چھُری دوسروں کے لئے ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہے۔ سالی، اپنی چیز ہے۔ مُجھے نقصان کیسے پہنچائے گی؟"

چھُری سے جو رشتہ اس نے قائم کیا تھا وہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماں یا باپ کہے کہ یہ میرا بیٹا ہے، یا بیٹی ہے۔ اس کا ہاتھ مُجھ پر کیسے اُٹھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر آ گیا ــــ اس کا نام پنٹو تھا، اور میں منٹو ــــ اس نے ممد بھائی کو اپنے کرسچین انداز میں سلام کیا اور پُوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ جو معاملہ تھا، وہ ممد بھائی نے بیان کر دیا۔ مختصر لیکن کڑے الفاظ میں، جن میں تحکم تھا، کہ دیکھو اگر تم نے منٹو بھائی کا علاج اچھی طرح نہ کیا تو تمہاری خیر نہیں۔

ڈاکٹر پنٹو نے فرماں بردار لڑکے کی طرح اپنا کام کیا۔ میری نبض دیکھی ــــ سٹیتھوسکوپ لگا کر میرے سینے اور پیٹھ کا معائنہ کیا۔ بلڈ پریشر دیکھا۔ مُجھ سے میری بیماری کی تمام تفصیل پُوچھی۔ اس کے بعد اس نے مُجھ سے نہیں، ممد بھائی سے کہا: "کوئی فکر کی بات نہیں ــــ ملیریا ہے ــــ میں انجکشن لگا دیتا ہُوں"۔

ممد بھائی مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے ڈاکٹر پنٹو کی بات سنی اور خنجر سے اپنی کلائی کے بال اڑاتے ہوئے کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا انجکشن دینا ہے تو دے دو، لیکن اگر اسے کچھ ہو گیا تو..."

ڈاکٹر پنٹو کانپ گیا۔ "نہیں ممد بھائی ـــــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ممد بھائی نے اپنے نیفے میں اڑس لیا۔ "تو ٹھیک ہے۔"

"تو میں انجکشن لگاتا ہوں۔" ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور سرنج نکالی ـــــ

"ٹھہرو ـــــ ٹھہرو ـــــ"

ممد بھائی گھبرا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے سرنج فوراً بیگ میں واپس رکھ دی، اور ممیاتے ہوئے ممد بھائی سے مخاطب ہوا۔ "کیوں؟"

"بس ـــــ میں کسی کے سوئی لگتے نہیں دیکھ سکتا۔" یہ کہہ کر وہ کھولی سے باہر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی چلے گئے۔

ڈاکٹر پنٹو نے میرے کونین کا انجکشن لگایا۔ بڑے سلیقے سے، ورنہ ملیریا کا یہ انجکشن بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے اس سے فیس پوچھی۔ اس نے کہا دس روپے! میں تکیے کے نیچے سے اپنا بٹوا نکال رہا تھا۔ کہ ممد بھائی اندر آ گیا۔ اس وقت میں دس روپے کا نوٹ ڈاکٹر پنٹو کو دے رہا تھا۔

ممد بھائی نے غضب آلود نگاہوں سے مجھے اور ڈاکٹر کو دیکھا اور گرج کر کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "فیس دے رہا ہوں۔"

ممد بھائی ڈاکٹر پنٹو سے مخاطب ہوا۔ "سالے یہ فیس کیسی لے رہے ہو؟"

ڈاکٹر پنٹو بوکھلا گیا۔ "میں کب لے رہا ہوں ـــــ یہ دے رہے تھے!"

"سالا ـــــ ہم سے فیس لیتے ہو ـــــ واپس کرو یہ نوٹ۔" ممد بھائی کے لہجے میں اس کے خنجر ایسی تیزی تھی۔

ڈاکٹر پنٹو نے مجھے نوٹ واپس کر دیا اور بیگ بند کر کے ممد بھائی سے معذرت طلب کرتے ہوئے چلا گیا۔

ممد بھائی نے ایک انگلی سے اپنی کانٹوں ایسی مونچھوں کو تاؤ دیا اور مسکرایا۔ "منٹو بھائی —— یہ بھی کوئی بات ہے کہ اس علاقے کا ڈاکٹر تم سے فیس لے —— تمہاری قسم اپنی مونچھیں منڈوا دیتا اگر اس سالے نے فیس لی ہوتی —— یہاں سب تمہارے غلام ہیں۔"

تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ "ممد بھائی! تم مجھے کیسے جانتے ہو؟"

ممد بھائی کی مونچھیں تھرتھرائیں۔ "ممد بھائی کسے نہیں جانتا —— ہم یہاں کے بادشاہ ہیں پیارے —— اپنی رعایا کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری سی، آئی، ڈی ہے۔ وہ ہمیں بتاتی رہتی ہے —— کون آیا ہے، کون گیا ہے، کون اچھی حالت میں ہے۔ کون بری حالت میں —— تمہارے متعلق ہم سب کچھ جانتے ہیں۔"

میں نے از راہِ تفنن پوچھا۔ "کیا جانتے ہیں آپ؟"

"سالا —— ہم کیا نہیں جانتے —— تم امرتسر کا رہنے والا ہے —— کشمیری ہے۔ یہاں اخباروں میں کام کرتا ہے —— تم نے بسم اللہ ہوٹل کے دس روپے دینے ہیں، اسی لئے تم ادھر سے نہیں گذرتے۔ بھنڈی بازار میں ایک پان والا تمہاری جان کو روتا ہے۔ اس سے تم بیس روپے دس آنے کے سگریٹ لے کر پھونک چکے ہو۔"

میں پانی پانی ہو گیا۔

ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور مسکرا کر کہا۔ "منٹو بھائی! کچھ فکر نہ کرو۔ تمہارے سب قرض چکا دیئے گئے ہیں۔ اب تم نئے سرے سے معاملہ شروع کر سکتے ہو۔ میں نے ان سالوں سے کہہ دیا ہے کہ خبردار اگر منٹو بھائی کو تم نے تنگ کیا —— اور ممد بھائی تم سے کہتا ہے کہ انشاء اللہ کوئی تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ بیمار تھا، کونین کا ٹیکہ لگ چکا تھا جس

کے باعث کانوں میں شائیں شائیں ہورہی تھی۔ اس کے علاوہ میں اس کے خلوص کے نیچے اتنا دب چکا تھا کہ اگر مجھے کوئی نکالنے کی کوشش کرتا تو اسے بہت محنت کرنا پڑتی۔۔۔ میں صرف اتنا کہہ سکا۔" ممد بھائی! خدا تمہیں زندہ رکھے۔۔۔ تم خوش رہو"

ممد بھائی نے اپنی مونچھوں کے بال ذرا اوپر کئے اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

ڈاکٹر پنٹو ہر روز صبح شام آتا رہا۔ میں نے اس سے کئی مرتبہ فیس کا ذکر کیا۔ مگر اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔" نہیں مسٹر منٹو! ممد بھائی کا معاملہ ہے، میں ایک ڈیڑھیا بھی نہیں لے سکتا!"

میں نے سوچا، یہ ممد بھائی کوئی بہت بڑا آدمی ہے۔ یعنی خوفناک قسم کا جس سے ڈاکٹر پنٹو جو بڑا خسیس قسم کا آدمی ہے، ڈرتا ہے اور مجھ سے فیس لینے کی جرأت نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ وہ اپنی جیب سے انجکشنوں پر خرچ کررہا ہے۔

بیماری کے دوران میں ممد بھائی بھی بلا ناغہ آتا رہا۔ کبھی صبح آتا تھا، کبھی شام کو۔ اپنے چھ سات شاگردوں کے ساتھ، اور مجھے ہر ممکن طریقے سے ڈھارس دیتا تھا۔ کہ معمولی ملیریا ہے۔ تم ڈاکٹر پنٹو کے علاج سے انشاءاللہ بہت جلد ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ گے۔"

پندرہ روز کے بعد ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ اس دوسال میں ممد بھائی کے ہر خدوخال کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہوں، وہ چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ عمر یہی پچیس تیس کے درمیان ہو گی۔ پتلی پتلی باہیں، ٹانگیں بھی ایسی ہی تھیں۔ ہاتھ بلا کے پھرتیلے تھے۔ ان سے جب وہ چھوٹا سا تیز دھار چاقو کسی دشمن پر پھینکتا تھا۔ تو وہ سیدھا اس کے دل میں کھبتا تھا یہ مجھے عرب گلی کے لوگوں نے بتایا تھا۔

اس کے متعلق بے شمار باتیں مشہور تھیں۔ اس نے کسی کو قتل کیا تھا۔ میں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چھری مار وہ اول درجے کا تھا۔ بنوٹ اور گتکے کا ماہر۔ یوں سب

کہتے تھے کہ وہ سینکڑوں قتل کر چکا ہے۔ مگر میں یہ اب ماننے کو تیار نہیں۔

لیکن جب میں اس کے خنجر کے متعلق سوچتا ہوں تو میرے تن بدن پر جھرجھری سی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ خوفناک ہتھیار وہ کیوں ہر وقت اپنی شلوار کے نیفے میں اڑسے رہتا ہے؟۔

میں جب اچھا ہو گیا تو ایک دن عرب گلی کے ایک تھرڈ کلاس چینی ریستوران میں اس سے میری مُلاقات ہُوئی۔ وہ اپنا وہی خوفناک خنجر نکال کر اپنے ناخن کاٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے پُوچھا: "ممد بھائی ـــــ آج کل بندوق پستول کا زمانہ ہے ـــــ تم یہ خنجر کیوں لیے پھرتے ہو؟"

ممد بھائی نے اپنی کرخت مونچھوں پر ایک انگلی پھیری اور کہا "منٹو بھائی بندوق پستول میں کوئی مزا نہیں۔ انہیں کوئی بچہ بھی چلا سکتا ہے۔ گھوڑا دبایا اور ٹھاہ..... اس میں کیا مزا ہے ـــــ؟ یہ چیز..... یہ خنجر..... یہ چھُری..... یہ چاقو..... مزا آتا ہے نا خُدا کی قسم ـــــ یہ وہ ہے..... تم کیا کہا کرتے ہو؟..... ہاں..... آرٹ..... اس میں آرٹ آتا ہے میری جان..... جس کو چاقو یا چھُری چلانے کا آرٹ نہ آتا ہو وہ ایک دم کنڈم ہے پستول کیا ہے ـــــ کھلونا ہے ـــــ جو نقصان پہنچا سکتا ہے ـــــ پر اس میں کیا لطف آتا ہے ـــــ کچھ بھی نہیں ـــــ تم یہ خنجر دیکھو ـــــ اس کی تیز دھار دیکھو" یہ کہتے ہُوئے اس نے انگوٹھے پر لب لگایا اور اس کی دھار پہ پھیرا: "اس سے کوئی دھماکہ نہیں ہوتا ـــــ بس، یُوں پیٹ کے اندر داخل کر دو ـــــ اس صفائی سے کہ اس سالے کو معلوم تک نہ ہو..... بندوق پستول سب بکواس ہے۔"

ممد بھائی سے اب ہر روز کسی نہ کسی وقت مُلاقات ہو جاتی تھی۔ میں اس کا ممنونِ احسان تھا ـــــ لیکن جب میں اس کا ذکر کرتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ کہتا تھا کہ میں نے تُم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ تو میرا فرض تھا۔

جب میں نے کچھ تفتیش کی تو مجھے معلوم ہُوا کہ فارس روڈ کے علاقے کا وہ ایک قسم کا حاکم

تھا۔ ایسا حاکم جو ہر شخص کی خبر گیری کرتا تھا۔ کوئی بیمار ہو، کسی کے کوئی تکلیف ہو، ممد بھائی اس کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اور یہ اس کی سی، آئی، ڈی کا کام تھا جو اس ہر چیز سے باخبر رکھتی تھی۔

وہ دادا تھا یعنی ایک خطرناک غنڈہ۔ لیکن میری سمجھ میں اب بھی نہیں آتا کہ وہ کس لحاظ سے غنڈہ تھا۔ خدا واحد شاہد ہے میں نے اس میں کوئی غنڈہ پن نہیں دیکھا۔ ایک صرف اس کی مونچھیں تھیں جو اس کو ہیبت ناک بنائے رکھتی تھیں۔ لیکن اس کو ان سے پیار تھا۔ وہ ان کی اس طرح پرورش کرتا تھا جس طرح کوئی اپنے بچے کی کرے۔

اس کی مونچھوں کا ایک ایک بال کھڑا تھا، جیسے خار پشت کا ــــ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ ممد بھائی ہر روز اپنی مونچھوں کو بالائی کھلاتا ہے۔ جب کھانا کھاتا ہے تو سالن بھری انگلیوں سے اپنی مونچھیں ضرور مروڑتا ہے کہ بزرگوں کے کہنے کے مطابق یوں بالوں میں طاقت آتی ہے۔

میں اس سے پیشتر غالباً کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس کی مونچھیں بڑی خوفناک تھیں۔ دراصل مونچھوں کا نام ہی ممد بھائی تھا ــــ یا اس خنجر کا جو اس کی تنگ گھیرے کی شلوار کے نیفے میں ہر وقت موجود رہتا تھا ــــ مجھے ان دونوں چیزوں سے ڈر لگتا تھا، نہ معلوم کیوں ــــ

ممد بھائی یوں تو اس علاقے کا بہت بڑا دادا تھا، لیکن وہ سب کا ہمدرد تھا۔ معلوم نہیں اس کی آمدنی کے کیا ذرائع تھے، پر وہ ہر حاجت مند کی بر وقت مدد کرتا تھا۔ اس علاقے کی تمام رنڈیاں اس کو اپنا پیر مانتی تھیں۔ چونکہ وہ ایک مانا ہوا غنڈہ تھا، اس لئے لازم تھا کہ اس کا تعلق وہاں کسی طوائف سے ہوتا، مگر مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کے سلسلے سے اس کا دُور کا بھی تعلق نہیں رہا تھا۔

میری اس سے بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ ان پڑھ تھا، لیکن جانے کیوں وہ میری اتنی عزت کرتا تھا کہ عرب گلی کے تمام آدمی رشک کھاتے تھے۔ ایک دن صبح سویرے دفتر جاتے وقت میں نے چینی کے ہوٹل میں کسی سے سنا کہ ممد بھائی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ مجھے

بہت تعجب ہُوا، اس لئے کہ تمام تھانے والے اس کے دوست تھے۔ کیا وجہ ہو سکتی تھی؟
میں نے اس آدمی سے پُوچھا کہ کیا بات ہُوئی جو ممد بھائی گرفتار ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اسی عرب گلی ایک عورت رہتی ہے، جس کا نام شیریں بائی ہے۔ اس کی ایک نوجوان لڑکی ہے، اس کو کل ایک آدمی نے خراب کر دیا یعنی اس کی عصمت دری کر دی۔ شیریں بائی رُوتی ہُوئی ممد بھائی کے پاس آئی اور اس سے کہا "تم یہاں کے داوا ہو۔ میری بیٹی سے فلاں آدمی نے بُرا کیا ہے —— لعنت ہے تم پر کہ تم گھر میں بیٹھے ہو" ممد بھائی نے یہ موٹی گالی اس بڑھیا کو دی اور کہا "تم چاہتی کیا ہو؟" اس نے کہا "میں یہ چاہتی ہُوں کہ تم اس حرام زادے کا پیٹ چاک کر دو"

ممد بھائی اس وقت ہوٹل میں سیس پاؤں کے ساتھ قیمہ کھا رہا تھا۔ یہ سُن کر اس نے اپنے نیفے میں سے خنجر نکالا۔ اس پر انگوٹھا پھیر کر اس کی دھار دیکھی۔ اور بڑھیا سے کہا "جا —— تیرا کام ہو جائے گا"

اور اس کا کام ہو گیا —— دُوسرے معنوں میں جس آدمی نے بڑھیا کی لڑکی کی عصمت دری کی تھی، آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس کا کام تمام ہو گیا۔

ممد بھائی گرفتار تو ہو گیا تھا۔ مگر اس نے کام اتنی ہوشیاری اور چابکدستی سے کیا تھا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی عینی شاہد موجود بھی ہوتا تو وہ عدالت میں بیان نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اس کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

دو دن حوالات میں رہا تھا، مگر اس کو وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ پولیس کے سپاہی، انسپکٹر، سب انسپکٹر، سب اس کو جانتے تھے لیکن جب وہ ضمانت پر رہا ہو کر باہر آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا پہنچا ہے۔ اس کی مونچھیں جو خوفناک طور پر اُوپر کو اُٹھی ہُوئی تھیں، اب کسی قدر جھکی ہُوئی تھیں۔

چینی کے ہوٹل میں اس سے میری مُلاقات ہُوئی۔ اس کے کپڑے جو ہمیشہ اُجلے ہوتے

تھے، میلے تھے۔ میں نے اس سے قتل کے متعلق کوئی بات نہ کی لیکن اس نے خود کہا "منٹو صاحب! مجھے اس بات کا افسوس کہ سالا دیر سے مرا ـــــ چھری مارنے میں مجھ سے غلطی ہو گئی، ہاتھ ٹیڑھا پڑا ـــــ لیکن وہ اس سالے کا قصور تھا ـــــ ایک دم مڑ گیا۔ اس وجہ سے سارا معاملہ کنڈم ہو گیا ـــــ لیکن مر گیا ـــــ ذرا تکلیف کے ساتھ، جس کا مجھے افسوس ہے۔"

آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ یہ سُن کر میرا ردِعمل کیا ہو گا۔ یعنی اس کو افسوس تھا کہ وہ اُسے بطریقِ احسن قتل نہ کر سکا۔ اور یہ کہ مرنے میں اسے ذرا تکلیف ہوئی ہے۔

مقدمہ چلنا تھا ـــــ اور ممد بھائی اس سے بہت گھبراتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں عدالت کی شکل کبھی نہیں دیکھی تھی۔ معلوم نہیں اس نے اس سے پہلے بھی قتل کیے تھے کہ نہیں لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، وہ مجسٹریٹ، وکیل اور گواہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس لئے کہ اس کا سابقہ ان لوگوں سے کبھی پڑا ہی نہیں تھا۔

وہ بہت فکر مند تھا۔ پولیس نے جب کیس پیش کرنا چاہا اور تاریخ مقرر ہو گئی تو ممد بھائی بہت پریشان ہو گیا۔ عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے کیسے حاضر ہُوا جاتا ہے اس کے متعلق اس کو قطعاً معلوم نہیں تھا۔ بار بار وہ اپنی کرخت مونچھوں پر انگلیاں پھیرتا تھا۔ اور مجھ سے کہتا تھا "منٹو صاحب! میں مر جاؤں گا، پر کورٹ میں نہیں جاؤں گا ـــــ سالی معلوم نہیں کیسی جگہ ہے۔"

عرب گلی میں اس کے کئی دوست تھے۔ انہوں نے اس کو ڈھارس دی کہ معاملہ سنگین نہیں ہے۔ کوئی گواہ موجود نہیں، ایک صرف اس کی مونچھیں ہیں جو مجسٹریٹ کے دل میں اس کے خلاف یقینی طور پہ کوئی مخالف جذبہ پیدا کر سکتی ہیں۔

جیسا کہ میں اس سے پیشتر کہہ چکا ہُوں اس کی مونچھیں ہی تھیں جو اس کو خوفناک بناتی تھیں ـــــ اگر یہ نہ ہوتیں تو وہ ہرگز ہرگز "دادا" دکھائی نہ دیتا۔

اس نے بہت غور کیا۔ اس کی ضمانت تھانے ہی میں ہو گئی تھی۔ اب اسے عدالت میں پیش ہونا تھا۔ مجسٹریٹ سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ ایرانی کے ہوٹل میں جب میری اس کی ملاقات ہُوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کو اپنی مونچھوں کے متعلق بڑی فکر تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ ان کے ساتھ اگر وہ عدالت میں پیش ہُوا تو بہت ممکن ہے، اس کو سزا ہو جائے۔

آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کہانی ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ بہت پریشان تھا۔ اس کے تمام شاگرد حیران تھے۔ اس لئے کہ وہ کبھی حیران و پریشان نہیں ہُوا تھا۔ اس کو مونچھوں کی فکر تھی۔ کیونکہ اس کے بعض قریبی دوستوں نے اس سے کہا تھا۔

"ممد بھائی ـــ کورٹ میں جانا ہے تو ان مونچھوں کے ساتھ کبھی نہ جانا۔ مجسٹریٹ تم کو اندر کر دے گا۔"

اور وہ سوچتا تھا ـــ ہر وقت سوچتا تھا کہ اس کی مونچھوں نے اس آدمی کو قتل کیا ہے یا اس نے ـــ لیکن کسی نتیجے پر پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنا خنجر، معلوم نہیں، جو پہلی مرتبہ خُون آشنا ہُوا تھا، یا اس سے پہلے کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔ اپنے نیفے سے نکالا اور ہوٹل کے باہر گلی میں پھینک دیا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں اس سے پُوچھا۔ "ممد بھائی! ـــ یہ کیا؟"

"کچھ نہیں، منٹو بھائی۔ بہت گھوٹالا ہو گیا ہے۔ کورٹ میں جانا ہے ـــ یار دوست کہتے ہیں کہ تمہاری مونچھیں دیکھ کر وہ ضرور تُم کو سزا دے گا ـــ اب بولو، میں کیا کروں؟"

میں نے اس سے پُوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال جو کچھ بھی ہے وہ تم نہ پُوچھو ـــ لیکن یہاں ہر شخص کا یہی خیال ہے کہ میں انہیں منڈوا دوں تاکہ وہ سالا مجسٹریٹ مہربان ہو جائے۔ تو منڈوا دوں۔ منٹو بھائی ـــ؟"

میں نے کچھ توقف کے بعد اس سے کہا۔ "ہاں، اگر مناسب سمجھتے ہو تو منڈوا دو ـــ

عدالت کا سوال ہے، اور تمہاری موچھیں واقعی بڑی خوفناک ہیں۔"

دُوسرے دن ممد بھائی نے اپنی موچھیں ــــ اپنی جان سے عزیز موچھیں منڈوا ڈالیں کیونکہ اس کی عزت خطرے میں تھی ــــ لیکن صرف دوسروں کے مشورے پر ــــ

مسٹر ایف، ایچ، ٹیل کی عدالت میں اس کا مقدمہ پیش ہُوا۔ موچھوں کے بغیر ممد بھائی پیش ہُوا۔ میں بھی وہاں موجود تھا، اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہیں تھی لیکن مجسٹریٹ صاحب نے اس کو خطرناک غنڈہ قرار دیتے ہوئے تڑی پار یعنی صُوبہ بدر کر دیا۔ اس کو صرف ایک دن ملا تھا جس میں اسے اپنا تمام حساب کتاب طے کر کے بمبئی چھوڑ دینا تھا۔

عدالت سے باہر نکل کر اس نے مُجھ سے کوئی بات نہ کی۔ اس کی چھوٹی بڑی انگلیاں بار بار بالائی ہونٹ کی طرف بڑھتی تھیں، ــــ مگر وہاں کوئی بال ہی نہیں تھا۔

شام کو جب اسے بمبئی چھوڑ کر کہیں اور جانا تھا، میری اس کی مُلاقات ایرانی ہوٹل میں ہُوئی۔ اس کے دس بیس شاگرد آس پاس کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے جب میں اس سے ملا تو اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی ــــ موچھوں کے بغیر وہ بہت شریف آدمی دکھائی رہا تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت مغموم ہے۔

اس کے پاس کرسی پر بیٹھ کر میں نے اس سے کہا۔" کیا بات ہے ممد بھائی ــــ؟

اس نے جواب میں ایک بہت بڑی گالی خُدا معلوم کس کو دی اور کہا۔ سالا، اب ممد بھائی ہی نہیں رہا۔"

مجھے معلُوم تھا کہ وہ صُوبہ بدر کیا جا چُکا ہے۔" کوئی بات نہیں ممد بھائی! ــــ یہاں نہیں تو کسی اور جگہ سہی۔"

اس نے تمام جگہوں کو بے شمار گالیاں دیں۔" سالا ــــ اپن کو یہ غم نہیں ــــ یہاں رہیں یا کسی اور جگہ رہیں ــــ یہ سالا موچھیں کیوں منڈوائیں؟"

پھر اس نے ان لوگوں کو جنہوں نے اس کو موچھیں منڈوانے کا مشورہ دیا تھا ایک کروڑ

گالیاں دیں اور کہا "سالا اگر مجھے ترٹی پار ہی ہونا تھا تو مونچھوں کے ساتھ کیوں نہ ہُوا ——"

مجھے ہنسی آگئی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ "سالا تُم کیسا آدمی ہے، وسٹو —— ہم سچ کہتا ہے، خُدا کی قسم —— ہمیں پھانسی لگا دیتے . . . . . پر . . . . . یہ بے وقوفی تو ہم نے خُود کی —— آج تک کسی سے نہ ڈرا تھا —— سالا اپنی مونچھوں سے ڈر گیا" یہ کہہ کر اس نے دو ہتڑ اپنے مُنہ پر مارا۔ "ممد بھائی لعنت ہے تجھ پر —— سالا —— اپنی مونچھوں سے ڈر گیا —— اب جا اپنی ماں کے . . . . . !"

اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، جو اس کے مونچھوں بغیر چہرے پر کچھ عجیب سے دکھائی دیتے تھے۔

("سرکنڈوں کے پیچھے" سے)

گورمکھ سنگھ کی وصیّت

پہلے چھُرا بھونکنے کی اکاّدُکاّ وارداتیں ہوتی تھیں، اب دونوں فریقوں میں باقاعدہ لڑائی کی خبریں آنے لگی تھیں جن میں چاقو چھریوں کے علاوہ کرپانیں تلواریں اور بندوقیں عام استعمال کی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی دیسی ساخت کے بم پھٹنے کی اِطلاع بھی ملتی تھی۔

امرتسر میں قریب قریب ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ یہ فرقہ وارانہ فسادات دیر تک جاری نہیں رہیں گے۔ جوش ہے۔ جونہی ٹھنڈا ہُوا، فضا پھر اپنی اصلی حالت پر آجائے گی۔ اس سے پہلے ایسے کئی فسادامرتسر میں ہو چکے تھے جو دیر پا نہیں تھے۔ دس پندرہ روز تک مارکٹائی کا ہنگامہ رہتا تھا، پھر خود بخود فرو ہو جاتا تھا۔ چنانچہ پُرانے تجربے کی بنا پر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ یہ آگ تھوڑی دیر کے بعد اپنا زور ختم کر کے ٹھنڈی ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ بلووں کا زور دن بدن بڑھتا ہی گیا۔

ہندوؤں کے محلّے میں جو مُسلمان رہتے تھے بھاگنے لگے۔ اسی طرح وہ ہندو جو مُسلمانوں کے محلّے میں تھے اپنا گھر بار چھوڑ کے محفوظ مقاموں کا رُخ کرنے لگے۔ مگر یہ انتظام سب کے نزدیک عارضی تھا، اُس وقت تک کے لِئے جب فضا فسادات کے تکدر سے پاک ہو جانے والی تھی۔

میاں عبدالحیٔ ریٹائرڈ سب جج کو تو سو فیصدی یقین تھا کہ صورتِ حالات بہت جلد دُرست ہو جائے گی، یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہیں تھے۔ ان کا ایک لڑکا تھا گیارہ برس کا۔ ایک لڑکی تھی سترہ برس کی۔ ایک پُرانا ملازم تھا جس کی عُمر ستّر کے لگ بھگ تھی مختصر سا خاندان تھا جب فسادات شرُوع ہُوئے تو میاں صاحب نے بطورِ حفظِ ماتقدم کافی راشن گھر میں جمع کر لیا تھا۔ اس طرف سے وہ بالکل مطمئن تھے کہ اگر خُدانخواستہ حالات کچھ زیادہ بگڑ گئے اور دُکانیں وغیرہ بند ہو گئیں تو اُنہیں کھانے پینے کے معاملے میں تردد نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن اُن کی جوان لڑکی صغریٰ بہت متردد تھی۔ ان کا گھر تین منزلہ تھا۔ دُوسری عمارتوں کے مقابلے میں کافی اُونچا۔ اس کی مَمٹی سے شہر کا تین چوتھائی حصہ بخوبی نظر آتا تھا۔ صغریٰ اب کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ نزدیک دُور کہیں نہ کہیں آگ لگی ہوتی ہے۔ شرُوع شرُوع میں تو فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن سنائی دیتی تھی پر اب وہ بھی بند ہو گئی تھی، اس لئے کہ جگہ جگہ آگ بھڑکنے لگی تھی۔

رات کو اب کچھ اور ہی سماں ہوتا۔ گھپ اندھیرے میں آگ کے بڑے بڑے شعلے اُٹھتے تھے جیسے دیو ہیں جو اپنے مُنہ سے آگ کے فوارے چھوڑ رہے ہیں۔ پھر عجیب عجیب سی آوازیں آتیں جو ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ مل کر بہت ہی وحشت ناک بن جاتیں۔

صغریٰ باپ سے اپنے خوف و ہراس کا ذکر نہیں کرتی تھی۔ اس لئے کہ وہ ایک بار گھر میں کہہ چکے تھے کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں، سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میاں صاحب کی باتیں اکثر دُرست ہُوا کرتی تھیں۔ صغریٰ کو اس سے ایک گونہ اطمینان تھا۔ مگر جب بجلی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ساتھ ہی نلوں میں پانی آنا بند ہو گیا۔ تو اس نے میاں صاحب سے اپنی تشویش کا اظہار کیا، اور ڈرتے ڈرتے رائے دی تھی کہ چند روز کے لئے شریف پورے اُٹھ جائیں۔ جہاں اڑوس پڑوس کے سارے مُسلمان آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ میاں صاحب نے اپنا فیصلہ نہ بدلا اور کہا "بیکار گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حالات بہت جلدی

ٹھیک ہو جائیں گے۔"

مگر حالات بہت جلد ٹھیک نہ ہوئے اور دن بدن بگڑتے گئے۔ وہ محلّہ جس میں میاں عبدالحیٰ کا مکان تھا مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میاں صاحب پر ایک روز اچانک فالج گرا جس کے باعث وہ صاحب فراش ہو گئے۔ ان کا لڑکا بشارت بھی جو پہلے اکیلا گھر میں اوپر نیچے طرح طرح کے کھیلوں میں مصروف رہتا تھا۔ اب باپ کی چارپائی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور حالات کی نزاکت سمجھنے لگا۔

وہ بازار جو اُن کے مکان کے ساتھ ملحق تھا سنسان پڑا تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ کی ڈسپنسری مدت سے بند پڑی تھی۔ اُس سے کچھ دُور ہٹ کر ڈاکٹر گوراند تامل تھے۔ صغریٰ نے شہ نشین سے دیکھا تھا کہ ان کی دکان میں بھی تالے پڑے ہیں۔ میاں صاحب کی حالت بہت ہی مخدوش تھی۔ صغریٰ اس قدر پریشان تھی کہ اس کے ہوش و حواس بالکل جواب دے گئے تھے۔ بشارت کو الگ لیجا کر اس نے کہا۔" خدا کے لیئے، تم ہی کچھ کرو۔ میں جانتی ہوں کہ باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں، مگر تم جاؤ ــــــ کسی کو بھی بلا لاؤ۔ اباجی کی حالت بہت خطرناک ہے۔"

بشارت گیا، مگر فوراً ہی واپس آگیا۔ اُس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ چوک میں اس نے ایک لاش دیکھی تھی، خُون سے تر بتر ــــــ اور پاس ہی بہت سے آدمی ڈھاٹے باندھے ایک دُکان لُوٹ رہے تھے۔ صغریٰ نے اپنے خوفزدہ بھائی کو سینے کے ساتھ لگایا اور صبر شکر کر کے بیٹھ گئی۔ مگر اس سے اپنے باپ کی حالت نہیں دیکھی جاتی تھی۔

میاں صاحب کے جسم کا داہنا حصہ بالکل سُن ہو گیا تھا۔ جیسے اس میں جان ہی نہیں گویائی میں بھی فرق پڑ گیا تھا۔ اور وہ زیادہ تر اشاروں ہی سے باتیں کرتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ صغریٰ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے سب ٹھیک ہو جائے گا کچھ بھی ٹھیک نہ ہوا۔ روزے ختم ہونے والے تھے۔ صرف دو روز گئے تھے۔ میاں صاحب

کا خیال تھا کہ عید سے پہلے پہلے فضا بالکل صاف ہو جائے گی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید عید ہی کا روز روزِ قیامت ہو، کیونکہ ممٹی پر سے اب شہر کے قریب قریب ہر حصّے سے دُھوئیں کے بادل اُٹھتے دکھائی دیتے تھے۔ رات کو بم پھٹنے کی ایسی ایسی ہولناک آوازیں آتی تھیں کہ صغرےٰ اور بشارت ایک لحظے کے لئے بھی نہیں سو سکتے تھے۔ صغریٰ کو تو یُوں بھی باپ کی تیمار داری کے لئے جاگنا پڑتا تھا۔ مگر اب یہ دھماکے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے دماغ کے اندر ہو رہے ہیں۔ کبھی وہ اپنے مفلوج باپ کی طرف دیکھتی اور کبھی اپنے وحشت زدہ بھائی کی طرف ــــ ستر برس کا بڈھا ملازم اکبر تھا جس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ سارا دن اور ساری رات پڑا اپنی کوٹھڑی میں کھانستا کھنکارتا اور بلغم نکالتا رہتا تھا۔ ایک روز تنگ آکر صغریٰ اُس پر برس پڑی " تم کس مرض کی دوا ہو۔ دیکھتے نہیں ہو، میاں صاحب کی کیا حالت ہے۔ اصل میں تم پرلے درجے کے نمک حرام ہو۔ اب خدمت کا موقعہ آیا ہے تو دمے کا بہانہ کر کے یہاں پڑے رہتے ہو ــــ وہ بھی خادم تھے جو آقا کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے "۔

صغریٰ اپنا جی ہلکا کر کے چلی گئی۔ بعد میں اُس کو افسوس ہُوا کہ ناحق اُس غریب کو اتنی لعنت ملامت کی۔ رات کا کھانا تھال میں لگا کر اُس کوٹھڑی میں گئی تو دیکھا خالی ہے۔ بشارت نے گھر میں اِدھر اُدھر تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔ باہر کے دروازے کی کنڈی کھُلی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میاں صاحب کے لئے کچھ کرنے گیا ہے۔ صغریٰ نے بہت دُعائیں مانگیں کہ خُدا اُسے کامیاب کرے۔ لیکن دو دن گذر گئے اور وہ نہ آیا۔

شام کا وقت تھا۔ ایسی کئی شامیں صغریٰ اور بشارت دیکھ چُکے تھے۔ جب عید کی آمد آمد کے ہنگامے برپا ہوتے تھے۔ جب آسمان پر چاند دیکھنے کے لئے ان کی نظریں جمی رہتی تھیں۔ دُوسرے روز عید تھی۔ صرف چاند کو اس کا اعلان کرنا تھا۔ دونو اس اعلان کے لئے کتنے بےتاب ہُوا کرتے تھے۔ آسمان پر چاند والی جگہ پر اگر بادل کا کوئی ٹیلا ٹکڑا جم جاتا

تو کتنی کوفت ہوتی تھی انہیں، مگر اب چاروں طرف دھوئیں کے بادل تھے۔ صغریٰ اور بشارت دونو مٹی پر چڑھے۔ دُور کہیں کہیں کوٹھوں پر لوگوں کے سائے دھبّوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے، مگر معلوم نہیں یہ چاند دیکھ رہے تھے یا جگہ جگہ سلگتی اور بھڑکتی ہوئی آگ۔

چاند بھی کچھ ایسا ڈھیٹ تھا کہ دُھوئیں کی چادر میں سے بھی نظر آگیا۔ صغریٰ نے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگی کہ خُدا اپنا فضل کرے اور اُس کے باپ کو تندرستی عطا فرماتے۔ بشارت دل ہی دل میں کوفت محسوس کر رہا تھا کہ گڑبڑ کے باعث ایک اچھی بھلی عید غارت ہوگئی۔

دن ابھی پوری طرح ڈھلا نہیں تھا۔ یعنی شام کی سیاہی ابھی گہری نہیں ہُوئی تھی۔ میاں صاحب کی چارپائی چھڑکاؤ کئے ہُوئے صحن میں بچھی تھی۔ وہ اس پر بے حس و حرکت لیٹے تھے اور دُور آسمان پر نگاہیں جمائے جانے کیا سوچ رہے تھے۔ عید کا چاند دیکھ کر جب صغریٰ نے پاس آکر اُنہیں سلام کیا تو اُنہوں نے اشارے سے جواب دیا۔ صغریٰ نے سر جھکایا تو اُنہوں نے وہ بازو جو ٹھیک تھا اُٹھایا اور اس پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ صغریٰ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو میاں صاحب کی آنکھیں بھی نمناک ہوگئیں، مگر اُنہوں نے تسلّی دینے کی خاطر بمشکل اپنی مفلوج زبان سے یہ الفاظ نکالے "اللہ تبارکُ تعالیٰ سب ٹھیک کر دے گا۔"

عین اسی وقت باہر دروازے پر دستک ہُوئی۔ صغریٰ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے بشارت کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہوگیا تھا۔ دروازے پر دستک ہُوئی۔ میاں صاحب صغریٰ سے مخاطب ہُوتے "دیکھو کون ہے!"

صغریٰ نے سوچا کہ شاید بڈھا اکبر ہو۔ اس خیال ہی سے اُس کی آنکھیں تمتما اٹھیں۔ بشارت کا بازو پکڑ کر اُس نے کہا "جاؤ دیکھو ——— شاید اکبر آیا ہے۔"

یہ سُن کر میاں صاحب نے نفی میں یُوں سر ہلایا جیسے وہ یہ کہہ رہے ہیں "نہیں ——— یہ اکبر نہیں ہے۔"

صغریٰ نے کہا: "تو اور کون ہو سکتا ہے اباّ جی؟"

میاں عبدالحیؔ نے اپنی قوتِ گویائی پر زور دے کر کچھ کہنے کی کوشش کی کہ بشارت آگیا۔ وہ سخت خوفزدہ تھا۔ ایک سانس اُوپر، ایک نیچے، صغریٰ کو میاں صاحب کی چارپائی سے ایک طرف ہٹا کر اُس نے ہولے سے کہا۔ "ایک سکھ ہے!"

صغریٰ کی چیخ نکل گئی: "سکھ؟ —— کیا کہتا ہے؟"

بشارت نے جواب دیا: "کہتا ہے دروازہ کھولو۔"

صغریٰ نے کانپتے ہوئے بشارت کو کھینچ کر اپنے ساتھ چمٹا لیا اور باپ کی چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنے باپ کی طرف ویران نظروں سے دیکھنے لگی۔

میاں عبدالحیؔ کے پتلے پتلے بے جان ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ پیدا ہوئی: "جاؤ۔۔۔۔ گورمکھ سنگھ ہے!"

بشارت نے نفی میں سر ہلایا: "کوئی اور ہے؟"

میاں صاحب نے فیصلہ کُن انداز میں کہا: "جاؤ صغریٰ وہی ہے!"

صغریٰ اُٹھی۔ وہ گورمکھ سنگھ کو جانتی تھی۔ پنشن لینے سے کچھ دیر پہلے اس کے باپ نے اس نام کے ایک سکھ کا کوئی کام کیا تھا۔ صغریٰ کو اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ شاید اس کو ایک جھوٹے مقدمے سے نجات دلائی تھی۔ جب سے وہ ہر چھوٹی عید سے ایک دن پہلے رومالی سویّوں کا ایک تھیلا لیکر آیا کرتا تھا۔ اُس کے باپ نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا: "میاں صاحب واہگورو جی کی کرپا سے آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ یہ تو ایک تحفہ ہے جو میں جناب کی خدمت میں ہر سال لے کر آتا ہوں۔ مجھ پر جو آپ نے احسان کیا تھا اُس کا بدلہ تو میری سو پُشت بھی نہیں چُکا سکتی —— خدا آپ کو خوش رکھے۔"

سردار گورمکھ سنگھ کو ہر سال عید سے ایک روز پہلے سویّوں کا تھیلا لاتے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ صغریٰ کو حیرت ہوئی کہ اس نے دستک سُن کر یہ کیوں خیال نہ کیا کہ وہی ہو گا۔

مگر بشارت بھی تو اس کو سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا تھا، پھر اُس نے کیوں کہا کوئی اور ہے — اور کون ہو سکتا ہے۔ یہ سوچتی صغریٰ ڈیوڑھی تک پہنچی۔ دروازے کھولے یا اندر ہی سے پوچھے، اس کے متعلق وہ ابھی فیصلہ ہی کر رہی تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ صغریٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بمشکل تمام اس نے حلق سے آواز نکالی۔ "کون ہے؟"

بشارت پاس کھڑا تھا۔ اُس نے دروازے کی ایک درز کی طرف اشارہ کیا اور صغریٰ سے کہا: "اس میں سے دیکھو؟"

صغریٰ نے درز میں سے دیکھا۔ گورمکھ سنگھ نہیں تھا۔ وہ تو بہت بوڑھا تھا، لیکن یہ جو باہر تھڑے پر کھڑا تھا جوان تھا۔ صغریٰ ابھی درز پر آنکھ جمائے اس کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ اُس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ صغریٰ نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ میں کاغذ کا تھیلا تھا ویسا ہی جیسا گورمکھ سنگھ لایا کرتا تھا۔

صغریٰ نے درز سے آنکھ ہٹائی اور ذرا بلند آواز میں دستک دینے والے سے پوچھا۔ "کون ہیں آپ؟"

باہر سے آواز آئی۔ "جی.... جی میں —— میں سردار گورمکھ سنگھ کا بیٹا ہوں۔ سنتوکھ!"

صغریٰ کا خوف بہت حد تک دُور ہو گیا۔ بڑی شائستگی سے اس نے پوچھا۔ "فرمایئے۔ آپ کیسے آئے ہیں؟"

باہر سے آواز آئی۔ "جی.... جج صاحب کہاں ہیں؟"

صغریٰ نے جواب دیا۔ "بیمار ہیں۔"

سردار سنتوکھ سنگھ نے افسوس آمیز لہجے میں کہا: "اوہ......" پھر اُس نے کاغذ کا تھیلا کھڑکھڑایا۔ "جی یہ سوّیاں ہیں...... سردار جی کا دیہانت ہو گیا ہے..... وہ مر گئے ہیں!"

صغریٰ نے جلدی سے پُوچھا: "مر گئے ہیں؟"

باہر سے آواز آئی "جی ہاں —— ایک مہینہ ہو گیا ہے..... مرنے سے پہلے اُنہوں نے مجھے تاکید کی تھی کہ دیکھو بیٹا، میں جج صاحب کی خدمت میں پورے دس برس سے ہر چھوٹی بڑی عید پر سوّیاں لے جاتا رہا ہوں —— یہ کام میرے مرنے کے بعد اب تمہیں کرنا ہوگا —— میں نے اُنہیں بچن دیا تھا۔ جو میں پورا کر رہا ہوں.... لے لیجئے سوّیاں"۔

صغریٰ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ سردار گورمکھ سنگھ کے لڑکے نے سویوں کا تھیلا آگے بڑھا دیا۔ جو صغریٰ نے پکڑ لیا اور کہا "خدا سردار جی کو جنّت نصیب کرے۔"

گورمکھ سنگھ کا لڑکا کچھ توقف کے بعد بولا "جج صاحب بیمار ہیں؟"

صغریٰ نے جواب دیا "جی ہاں!"

"کیا بیماری ہے؟"

"فالج!"

"اوہ...... سردار جی زندہ ہوتے تو اُنہیں یہ سُن کر بہت دُکھ ہوتا —— مرتے دم تک اُنہیں جج صاحب کا احسان یاد تھا کہتے تھے کہ وہ اِنسان نہیں دیوتا ہے..... اللہ میاں اُنہیں زندہ رکھے...... اُنہیں میرا سلام۔"

اور یہ کہہ کر وہ تھڑے سے اُتر گیا —— صغریٰ سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ اسے ٹھیرائے اور کہے کہ جج صاحب کے لئے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر دے۔

سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا سنتوکھ جج صاحب کے مکان کے تھڑے سے اُتر کر چند گز آگے بڑھا تو چار ڈھاٹا باندھے ہوئے آدمی اُس کے پاس آئے دو کے پاس جلتی مشعلیں تھیں اور دو کے پاس مٹی کے تیل کے کنستر اور کچھ دُوسری آتش خیز چیزیں۔ ایک نے سنتوکھ سے پوچھا "کیوں سردار جی، اپنا کام کر آئے؟"

سنتوکھ نے سر ہلا کر جواب دیا "ہاں، کر آیا۔"

اُس آدمی نے ڈھاٹے کے اندر ہنس کر پوچھا: "تو کر دیں معاملہ ٹھنڈا جج صاحب کا؟"

"ہاں ـــــ جیسے تمہاری مرضی!" یہ کہہ کر سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا۔

('یزید' سے)

"منٹو نے بدی کی دُنیا تخلیق کی، کیونکہ وہ ایک اخلاقی فنکار تھا۔"

ممتاز شیریں (’قند‘ ممتاز شیریں نمبر)

موذیل

ترلوچن نے پہلی مرتبہ ـــــ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔

آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز، بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گئے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹمارہے ہیں۔

ترلوچن کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی ـــــ رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔ قریب قریب تین بجے تھے۔ ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی ترلوچن پنکھے کی میکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا۔ رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، تروتازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا جب وہ اوپر

آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت مضطرب اور ہیجان زدہ تھا، لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جو اس کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ کسی حد تک ٹھنڈا ہو گیا تھا وہ اب صاف طور پر سوچ سکتا تھا۔

کرپال کور اور اس کا سارا خاندان ——— محلّے میں تھا۔ جو کٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی۔ کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا، مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہو گیا تھا اور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا ——— غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا ——— اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا آس پاس سب مسلمان تھے، بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔ اور پنجاب سے دھڑا دھڑ خبریں آرہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہاتھ ——— مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم و نازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جا سکتا تھا۔

کرپال کور کی ماں اندھی تھی۔ باپ مفلوج۔ بھائی تھا، وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اُسے وہاں اپنے تازہ تازہ لیے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔

ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصّہ آتا تھا۔ اس نے جو کہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا، فسادات کی تیزی و تندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کر دیا تھا۔ اور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا: "نرنجن، یہ ٹھیکے ویکے ابھی رہنے دو۔ ہم ایک بہت نازک دَور سے گذر رہے ہیں۔ تمھارا اگرچہ رہنا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہاں سے اُٹھ جاؤ اور میرے یہاں چلے آؤ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہے لیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گذارہ کر لیا کرتا ہے ——— مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچر سُن کر صرف اپنی گھنی مونچھوں میں مُسکرا دیا "یار، تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو ——— میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔ یہ امرتسر یا لاہور نہیں۔ بمبئے ہے ——— بمبئے تمھیں یہاں آئے صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں ——— بارہ

برس سے ۔"

جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے۔ اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود بخود زائل ہو جاتا ہے جیسے اس کے پاس چھو منتر ہے —— یا وہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آ سکتی۔ مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ —— محلہ بالکل محفوظ نہیں۔ وہ صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لیے اچھا تھا —— وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو اور بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لیے میدان صاف ہو جاتا۔ خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگھر تھا۔ چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کی بجائے کھنگھر سنگھ کہتا۔

صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی —— ترلوچن کیسوں سے بے نیاز سر میں بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے —— کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ وہ یوں تو ہٹے کٹے کھنگھر سنگھ کی بہن تھی۔ مگر بہت ہی نرم و نازک لچکیلی تھی۔ اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی۔ وہ گٹھاؤ۔ وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنھیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔

اس کے نقش پتلے پتلے تھے۔ جیسے ابھی نامکمل ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا۔ مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ

کپڑے کی سطح ہوتی ہے ــــ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی گاؤں کا تھا۔ مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ ــــ لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سُنا۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سے پُر تھا۔ برما، سنگاپور، ہانگ کانگ ــــ پھر بمبئی، جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔

ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی۔ جو بُری نہیں تھی ــــ خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزار ہا دیئے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے، وہ موزیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو گوڈے گوڈے، عشق ہو گیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا۔ اسی دن اس کی مڈبھیڑ موزیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر دیوانی معلوم ہوتی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھی۔ جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیلی پڑی بڑی چھاتیاں چوتھائی کے قریب نظر آ رہی تھیں۔ باہیں جو کہ ننگی تھیں مہین مہین

بالوں سے اَٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے، مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی گئی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔ بہت ہی تنگ ——— جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔ کھڑاؤں پہنے تھی۔ ترلوچن ان کی آواز سن کر رُک گیا۔ موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی ——— ترلوچن بوکھلا گیا۔ جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ موذیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اُوپر آ رہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اُوپر، کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اور چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی ——— بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے اِدھر اُدھر تھیں اور..... جب ترلوچن نے اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل ——— ساری موذیل سے اُلجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب و موزوں الفاظ میں اس سے معافی مانگی۔ موذیل نے اپنا لبادہ ٹھیک کیا اور مسکرا دی۔ "یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے" اور وہ اُتری ہوئی کھڑاؤں میں اپنا انگوٹھا اور اس کی ساتھ والی اُنگلی پھنساتی کوری ڈور سے باہر چلی گئی۔

ترلوچن کا خیال تھا کہ موذیل سے دوستی پیدا کرنا شاید مشکل ہو۔ لیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھُل مِل گئی۔ لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خود سر تھی۔ وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اس سے کھاتی تھی۔ اس سے پیتی تھی۔ اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔ سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پر نہاتی تھی۔ لیکن جب وہ

باہوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔ کچھ اس طور پر اسے گھُرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہُوئی تھی۔ لاہور میں، برما میں، سنگاپور میں وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لئے خرید لیا کرتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں "گوڈے گوڈے" دھنس جائے گا۔ وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔ اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی۔ مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتی۔ کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لئے بغیر اس کے پہلو میں جا بیٹھتی۔

ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ ترلوچن نے خاص طور پر موذیل کے لئے پُرتکلف کھانے منگوائے ہیں۔ مگر اس کو کوئی اپنا پُرانا دوست نظر آ گیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنّا جاتا تھا، کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پُرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہو سکتا۔

جب اس سے مُلاقات ہوتی وہ اس سے کہتی "تم سکھ ہو —— یہ نازک باتیں تمھاری سمجھ میں نہیں آسکتیں"۔

ترلوچن جل بھُن جاتا اور پُوچھتا "کون سی نازک باتیں —— تمہارے پُرانے یاروں کی؟"

موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولھوں پر ٹکا کر اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی

کردیتی اور کہتی "یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو ___ ہاں وہ میرے یار ہیں ___ اور
مجھے اچھے لگتے ہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو"

ترلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا "اس طرح تمھاری میری کس طرح نبھے گی"
موذیل زور کا قہقہہ لگاتی "تم سچ مچ سکھ ہو ___ ایڈیٹ، تم سے کس نے
کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ ___ اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی
سکھنی سے شادی کر لو ___ میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا"

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت
میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے
اس کی اکثر توہین ہوتی تھی۔ معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت
ہی نہیں تھی، اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔ مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت
کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

عام طور پر توہین اور ہتک کا ردِ عمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا
نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں
روئی ٹھونس لی تھی۔ اس کو موذیل پسند تھی ___ پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں
سے کہا کرتا تھا "گوڈے گوڈے" اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔ اب اس کے سوا
اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی اس عشق کی دلدل
میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا۔ لیکن ثابت قدم رہا۔ آخر ایک روز جب
موذیل موج میں تھی۔ اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا "موذیل ___ کیا تم مجھ سے محبت
نہیں کر سکتی"

موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہو گئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے

لگی۔ پھر اس نے اپنی موٹی موٹی بھوری آنکھیں اُٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا "میں سکھ سے محبت نہیں کر سکتی۔"

ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی ——— "موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو ——— یہ میرا مذاق نہیں، میری محبت کا مذاق ہے۔"

موذیل اُٹھی اور اُس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا "تم شیو کرا لو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو ——— تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمھیں آنکھ ماریں گے۔ ——— تم خوبصورت ہو۔"

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کر دیئے۔

موذیل نے ایک "پھوں پھوں" کی اور اس کی گرفت سے علیحدہ ہو گئی "میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں ——— تم تکلیف نہ کرو۔"

ترلوچن چلایا "موذیل۔"

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی۔ جس پہ لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آ گئی تھیں "خدا کی قسم ——— تم اپنی داڑھی اور مونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے ——— ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں ——— بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہو گی۔"

ترلوچن غصّے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ موذیل بھی آ گئی اور اس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع

کردی ـــ اس میں جو پنیں لگی تھیں۔ وہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے دانتوں تلے دبالیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔ جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے۔ کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔ مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خد و خال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لیے تھے۔ اس کو اس کا احساس تھا مگر وہ ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار لڑکا تھا۔ اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کر دے، جن سے اس کے مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔

جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا " یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی " تمہارے بال بہت ملائم ہیں ــــ میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا ــــ ترلوچ ــــ تم یہ مجھے دے دو۔ میں انھیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی"

اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا " میں نے آج تک تمھارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا۔ تم کیوں اڑاتی ہو ــــ دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا ــــ میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔ مگر صرف اس لیے کر تا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے ــــ کیا تمھیں اس کا پتہ نہیں ؟"

موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا " مجھے معلوم ہے۔"

" پھر" ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کیے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ــــ

میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اُٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ "میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی۔"

ترلوچن اُچھل پڑا۔ "سچ؟"

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لیے چمکے۔ "ہاں!"

ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ "تو...... تو کب؟"

موذیل الگ ہٹ گئی۔ "جب ـــــ تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے!"

ترلوچن اس وقت "جو ہو سو ہو" بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا۔ "میں کل ہی کٹوا دوں گا۔"

موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔ "تم بکواس کرتے ہو ترلوچ ـــــ تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔"

اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا۔ "تم دیکھ لوگی۔"

"دیکھ لوں گی۔" اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور "پھوں پھوں" کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا ـــــ وہ کن کن اذیتوں سے گذرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لیے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیئے اور داڑھی بھی منڈوا دی ـــــ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف

ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا۔ جس پر ممبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لئے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔

ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیرس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ٹینکیوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بنا رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لئے آ جائے۔ موذیل آئی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لئے ٹھٹکی۔ پھر "مائی ڈارلنگ ترلوچ" کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔

اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا ـــــ موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا ـــــ ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچے کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا "نیچے کچھ پہن تو لیا کرو۔"

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا "مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ـــــ ایسے ہی چلتا ہے۔"

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آ گیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گئے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈمڈ ہو گئے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

"شادی کل ہو گی؟"

ضرور۔ موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہُوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی۔ اس لئے ان کو پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی۔ اس لئے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونہ بہتر ہے۔ پاس ہے اور ترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مُطابق پونہ روانہ ہو جانا تھا۔

موزیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس کے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موزیل نے اس کو انتظار کرنے کے لئے کہا تھا ——— ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دُوسرے روز اسے معلُوم ہُوا کہ وہ اپنے ایک پُرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے دیولالی چلی گئی ہے۔ اور ایک غیر معین عرصے کے لیئے وہیں رہے گی۔

ترلوچن پر کیا گذری؟ ——— یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصّہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھُول گیا ——— اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہوگئی۔ اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موزیل بہت واہیات لڑکی تھی۔ جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہُوئے تھے اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دُوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو یک گونہ تسکین ہُوئی تھی کہ وہ موزیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجُود کبھی کبھی موزیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کد کڑے لگاتی غائب ہو جاتی تھی ——— وہ بے حیا تھی ——— بے مروت تھی۔ اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لئے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کر رہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے۔ جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس

کے سوا کسی اور کے پاس ہو گی۔ حالانکہ اس کو موڈیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔

وہ اس پر سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا۔ لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موڈیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مرمٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی "تم سکھ ہو ــــ مجھے تم سے نفرت ہے!ــــ"

ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دو ٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈر ویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لئے کہ ان سے اس کو اُلجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا، مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تو وہ چڑ جاتی تھی "یہ حیا ویا کیا بکواس ہے ــــ اگر تمھیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو ــــ تم مجھے یہ بتاؤ کون سا لباس ہے جس میں آدمی ننگا نہیں ہو سکتا ــــ یا جس میں سے تمھاری نگاہیں پار نہیں ہو سکتیں ــــ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو ــــ تم سکھ ہو ــــ مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک رسلی سا انڈر ویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے ــــ

یہ بھی تمھاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح تمھارے مذہب میں شامل ہے ——— شرم آنی چاہیئے تمھیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ مذہب تمھارے انڈر ویئر میں چھپا بیٹھا ہے!"

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سُن کر غصّہ آتا تھا۔ مگر بعد میں غور و فکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرا دیا تھا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہُوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اُٹھائے اُٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹینکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رُک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کر دیا ——— کرپال کور۔ ایک پاکیزہ لڑکی، جس سے اس کو محبت ہُوئی تھی۔ خطرے میں تھی، وہ ایسے محلّے میں تھی جس میں کٹّر قسم کے مُسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین وارداتیں بھی ہو چکی تھیں ——— لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلّے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پروا کرتا۔ اس چالی کے مُسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کر سکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پُورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی۔ مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہُوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں اُنگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری

——— اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے کھڑاوٴں کی کرخت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کون ہو سکتا ہے؟ ——— بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاوں پہنتی تھیں ——— آواز قریب آتی گئی یک لخت اس نے دُوسری ٹینکی کے پاس موزیل کو دیکھا، جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا کرتہ پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی ——— اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہُوا کہ آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔

ترلوچن، پانی کے نل پر سے اُٹھا۔ اس نے سوچا "یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہو گئی ——— اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے"؟

موزیل نے ایک اور انگڑائی لی ——— اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ ڈھیلے ڈھالے کرُتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں ——— ترلوچن کی آنکھوں سے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل اُبھر آئے۔ وہ زور سے کھانسا۔ موزیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ردِ عمل بالکل خفیف تھا۔ کھڑاوٴں گھسیٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی مُنّی داڑھی دیکھنے لگی۔ "تُم پھر سکھ بن گئے ترلوچ؟" داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موزیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پُشت رگڑی اور مُسکرا کر کہا "۔اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیوبلو سکرٹ صاف ——— مگر وہ تو وہیں دیولالی میں رہ گئی ہے"۔

ترلوچن خاموش رہا۔

موزیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی۔ "بولتے کیوں نہیں سردار صاحب"؟

ترلوچن اپنی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اس نے صُبح کے ملگجے اندھیرے میں موزیل کے چہرے کو غور سے دیکھا ——— کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہُوئی تھی۔ ایک صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ ترلوچن نے اس

سے پوچھا۔" بیمار رہی ہو؟"

"نہیں" موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

"پہلے سے کمزور دکھائی دیتے ہو؟"

"میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں۔" موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔" تم گویا کہ ــــ اب پھر ــــ نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو۔"

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔" ہاں!"

"مبارک ہو۔" موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر جانے لگی۔ "کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کر دی۔"

ترلوچن نے آہستہ سے کہا۔" ہاں!"

"مبارک ہو ــــ اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟"

"نہیں"

"یہ بہت بری بات ہے۔" موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی۔" ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔ موذیل نے اٹھ کر اس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا۔" کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟"

"نہیں"

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جب اس نے "نہیں" کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری

سے موٹی رگ کے گوشت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔

مُسکرانے کے بعد وہ ہنسی "تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو۔ میں تُم سے شادی کر لوں گی۔"

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعزت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اور اسی سے شادی کرے گا ــــــ موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے۔ بدصورت ہے بے وفا ہے۔ بے مروّت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا "موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے ــــــ جو مذہب کی پابند ہے۔ اسی کے لئے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا "وہ مذہب کی پابند ہے تو تمھیں کیسے قبول کرے گی؟ ــــــ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو"؟

"اس کو ابھی تک معلوم نہیں ــــــ داڑھی میں نے تمھارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی ــــــ محض انتقامی طور پر ــــــ اس کے بعد میری کرپال کور سے مُلاقات ہُوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہُوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہُوتے ہیں ــــــ مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔" ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔

موذیل نے لمبا کرتہ اُٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی۔ "یہ بہت اچھا ہے .... مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے۔ دیکھا کس زور سے کاٹا ہے۔"

ترلوچن نے دُوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا۔ انگلی سے لب لگائی اور کُرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ "کب ہو رہی ہے تمھاری شادی؟"

ابھی کچھ پتہ نہیں "۔ یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا "ترلوچ ــــ تم کیا سوچ رہے ہو؟"

ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی "تم اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو ــــ جاؤ اس کو لے آؤ۔ ایسی کیا مشکل ہے؟"

"مشکل! ــــ موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں ــــ کسی بھی معاملے کی نزاکت ــــ تم ایک لاابالی قسم کی لڑکی ہو ــــ یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری "افسوس بی ڈیمڈ ــــ سلی ایڈیٹ ــــ تم یہ سوچو کہ تمہاری اُس ...... کیا نام ہے اس کا ...... اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے ...... تم بیٹھ گئے ہو تعلقات کا رونا رونے ...... تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے ــــ تم ایک سلی قسم کے آدمی ہو ــــ اور بہت ڈرپوک، مجھے نڈر مرد چاہیئے ...... لیکن چھوڑو ان باتوں کو ...... چلو آؤ تمہاری اس کور کو لے آئیں ۔!"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑ لیا ــــ ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا "کہاں سے؟"

"وہیں سے، جہاں وہ ہے ــــ میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں ــــ چلو آؤ میرے ساتھ"

"مگر سنو تو ــــ کرفیو ہے"

"موذیل کے لئے نہیں ــــ چلو آؤ"

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں

کی طرف کھلتا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ رُک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔

ترلوچن نے پوچھا "کیا بات ہے۔"

موذیل نے کہا "یہ تمھاری داڑھی —— لیکن خیر ٹھیک ہے۔ اتنی بڑی نہیں ہے —— ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو۔

"ننگے سر!" ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا۔ "میں ننگے سر نہیں جاؤں گا۔"

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا "کیوں؟"

ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی۔ "تم سمجھتی نہیں ہو۔ میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں۔"

"کیوں ٹھیک نہیں۔"

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا —— وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔ میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا۔"

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری "تم واقعی اوّل درجے کے ایڈیٹ ہو —— گدھے کہیں کے........ اس کی جان کا سوال ہے کیا نام ہے، تمھاری اس کورکا، جس سے تم محبت کرتے ہو۔"

ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ موذیل، وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے —— اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔"

موذیل چڑ گئی۔ "اوہ، تمھاری محبت بی ڈیمڈ —— میں پوچھتی ہوں، کیا سارے سکھ تمھاری طرح کے بیوقوف ہوتے ہیں —— اس کی جان کا خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے —— اور شاید وہ اپنا انڈرویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔"

ترلوچن نے کہا "وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔"

"بہت اچھا کرتے ہو ـــــ مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلّے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی ـــــ تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیئے جاؤ گے۔"

ترلوچن نے مختصر جواب دیا۔ "مجھے اس کی پرواہ نہیں ـــــ اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں تو پگڑی پہن کر جاؤں گا ـــــ میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!"

موذیل جھنجھلا گئی۔ اس زور سے اس نے پیچ و تاب کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔ "گدھے ـــــ تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔ جب تم نہ ہو گے ـــــ تمہاری وہ ـــــ کیا نام ہے اس بھڑوی کا ـــــ جب وہ بھی نہ رہے گی۔ اس کا خاندان تک نہ رہے گا ـــــ تم سکھ ہو ـــــ خُدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!"

ترلوچن بھنّا گیا۔ "بکواس نہ کرو!"

موذیل زور سے ہنسی۔ مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا۔ "ڈارلنگ، چلو، جیسے تمہاری مرضی ـــــ جاؤ پگڑی پہن آؤ۔ میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ ترلوچن نے اسے روکا۔ "تم کپڑے نہیں پہنو گی!"

موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ "نہیں ـــــ چلے گا اسی طرح۔"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اُتر گئی۔ ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال اُنگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اُتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے

نیچے اُتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کئے سگریٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر مُنہ بھر کے دُھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصّے میں کہا۔ "تم بہت ذلیل ہو۔"

موذیل مُسکرائی۔ "یہ تُم نے کوئی نئی بات نہیں کہی ـــــ اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ پگڑی تُم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تمھارے کیس ہیں۔"

بازار بالکل سنسان تھا ـــــ ایک صرف ہَوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کرفیو سے خوفزدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹریمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی اِنسان گذرا ہے نہ گزرے گا۔"

موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی، ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اُتار کر کوئی دُوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اُتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اسے کو یقین تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔ اس لئے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوفزدہ تھا۔ کوئی پتّا کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جا رہی تھی۔ سگریٹ کا دُھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کر رہی ہے۔

چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی۔ "اے ـــــ کدھر جا رہے ہو۔"

ترلوچن سہم گیا۔ موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا۔ "اوہ، تم —— ہم کو پہچانا نہیں تم نے —— موذیل ......" پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا۔ "اِدھر اس باجو —— ہمارا بہن رہتا ہے۔ اس کی طبیعت خراب ہے —— ڈاکٹر لے کر جارہا ہے ......"

سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگرٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ نکال کر دیا۔ "لو پیو" —— سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔ موذیل نے اپنے مُنہ سے سُلگا ہُوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا۔ "ہیر از لائٹ"!

سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔ موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی —— جس میں سے گذر کر انھیں محلے جانا تھا۔

ترلوچن خاموش تھا، مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کر کے ایک عجیب و غریب قسم کی مُسرت محسوس کر رہی ہے —— خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔ وہ جب جوہو پر اس کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لئے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دُور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں وہ ڈوب نہ جائے۔ جب واپس آتی تو اس کا جسم نیلوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ ڈر ڈر کے اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل میں کوئی چھُری مار نمودار نہ ہو جائے۔ موذیل رُک گئی۔ جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا۔ "ترلوچ ڈیئر —— اس طرح ڈرنا اچھا نہیں —— تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔ —— سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہُوئی بات ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کرکے دُوسری گلی میں پہنچے۔ جو اس محلّے کی طرف نکلتی تھی جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رُک گئی ــــ کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مارواڑی کی دکان لوٹی جارہی تھی۔ ایک لحظے کے لیے اس نے اس معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا "کوئی بات نہیں ــــ چلو آؤ۔"

دونوں چلنے لگے ــــ ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آرہا تھا۔ ترلوچن سے ٹکرا گیا۔ پرات گر گئی۔ اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔ اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا ــــ کہ موذیل آگئی۔ لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چُور ہے۔ اس نے زور سے اس آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا۔ "اے کیا کرتا ہے ــــ اپنے بھائی کو مارتا ہے ــــ ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے۔" پھر وہ ترلوچن سے مخاطب ہوئی۔

"کریم ــــ اٹھاؤ، یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر۔"

اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹھوکا دیا۔

"عیش کر سالی ــــ عیش کر۔" پھر اس نے پرات اُٹھائی اور یہ جا وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا۔ "کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرامزادے نے!"

موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا۔ "کوئی ذلیل حرکت نہیں ــــ سب چلتا ہے.......... آؤ۔"

اور وہ تیز تیز چلنے لگی ــــ ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیئے۔

یہ گلی طے کرکے دونوں اس محلّے میں پہنچ گئے۔ جہاں کرپال کور رہتی تھی۔

موذیل نے پُوچھا۔ "کس گلی میں جانا ہے؟"۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا "تیسری گلی میں ـــــ نکڑ والی بلڈنگ!"

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑبڑ دکھائی دی ـــــ ایک آدمی بڑی تیزی سے اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ٹھٹک گئی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا "ترلوچ ڈیئر ـــــ یہ پگڑی اُتار دو!"

ترلوچن نے جواب دیا "میں کسی صورت میں بھی نہیں اُتار سکتا!"

موذیل جھنجلا گئی "تمھاری مرضی ـــــ لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے۔"

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا ـــــ صاف گڑبڑ ہو رہی تھی اور بڑی پُراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اُٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا "دیکھو، ایسا کرو ـــــ میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں ـــــ تم میرے پیچھے آنا ـــــ بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو ـــــ سمجھے ـــــ مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔"

موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر

تھے ۔۔۔۔۔ سیڑھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موزیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔

اس نے ترلوچن سے پوچھا "کون سا مالا؟"

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "دوسرا۔"

"چلو"

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہولیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبّے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔

دوسرے ملے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر دستک دی۔ موزیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔

ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ مُنہ لگا کر آواز دی۔

"مہنگا سنگھ جی ۔۔۔۔۔ مہنگا سنگھ جی!"

اندر سے مہین آواز آئی "کون؟"

"ترلوچن!"

دروازہ دھیرے سے کھلا ۔۔۔۔۔ ترلوچن نے موزیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی۔ دونوں اندر داخل ہوئے ۔۔۔۔۔ موزیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا ۔۔۔۔۔ جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موزیل نے اس کو ایک لمحے کے لئے غور سے دیکھا پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا، موزیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے سے لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اُٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔

ترلوچن سرخ ہو گیا۔

موزیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا "ڈرو نہیں ترلوچن تمھیں لینے آیا ہے۔"

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موزیل سے

الگ ہوگئی۔

ترلوچن نے اس سے کہا: "سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں —— اور ماتاجی سے بھی —— لیکن جلدی کرو۔"

اتنے میں اُوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلّا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔

کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی: "اسے پکڑ لیا اُنھوں نے!"

ترلوچن نے پُوچھا: "کسے؟"

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کونے میں لے گئی: "پکڑ لیا تو اچھا ہُوا —— تم یہ کپڑے اتارو۔"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی کہ موذیل نے آناً فاناً اس کی قمیص اُتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی باہوں میں اپنے ننگے جسم کو چُھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے مُنہ دوسری طرف موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کُرتہ اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا آزار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اُتار کر، ترلوچن سے کہنے لگی: "جاؤ، اسے لے جاؤ —— لیکن ٹھہرو۔"

یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیئے اور اس سے کہا: "جاؤ —— جلدی نِکل جاؤ۔"

ترلوچن نے اس سے کہا: "آؤ۔" مگر فوراً ہی رُک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے ہُوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی باہوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہُوئے تھے

"تُم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موذیل کے لہجے میں چڑچڑا پن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا: "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔"

"جہنم میں جائیں وہ —— تم اسے لے جاؤ۔"

"اور تم ؟"

"میں آجاؤں گی۔"

ایک دم اُوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑادھڑ نیچے اُترنے لگے۔ دروازے کے پاس آکر اُنھوں نے کوٹنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔

کرپال کور کی اندھی ماں اور اس کا مفلوج باپ دُوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔

موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کو خفیف سا جھٹکا دے کر اس نے ترلوچن سے کہا۔ "سنو۔ اب صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے ——"

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی۔ "دروازہ"

موذیل، ترلوچن سے مخاطب رہی۔ "میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہُوں —— تم میرے پیچھے بھاگنا —— میں اُوپر چڑھ جاؤں گی —— تم بھی اُوپر چلے آنا —— یہ لوگ جو دروازے توڑ رہے ہیں، سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے......"

ترلوچن نے پھر پُوچھا۔ "پھر؟"

موذیل نے کہا۔ "یہ تمھاری —— کیا نام ہے اس کا —— موقعہ پاکر نکل جائے —— اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔"

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔ موذیل زور سے چلائی۔ دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری —— سب بوکھلا گئے۔ اُٹھ کر اس نے اُوپر کی سیڑھیوں کا رُخ کیا۔ ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔ سب ایک طرف ہٹ گئے۔

موذیل اندھا دُھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھی —— کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھیں

—— وہ لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے سنبھل کر اُن کے تعاقب میں دوڑے موذیل کا پاؤں پھسلا —— اُوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی، لوہے کے جنگلے کے ساتھ اُلجھتی نیچے آ رہی —— پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اُترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خُون بہہ رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے۔ ارد گرد جمع ہو گئے —— کسی نے پُوچھا "کیا ہُوا ہے۔" سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوچن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی "موذیل —— موذیل"

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔

ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مُسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خُون کے بلبلے اڑاتے ہُوئے کہا۔ "جاؤ، دیکھو —— میرا انڈر ویئر وہاں ہے کہ نہیں —— میرا مطلب ہے وہ۔۔۔۔۔۔"

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے میں کہا۔ "تم سچ مچ سکھ ہو۔۔۔۔۔۔۔ جاؤ دیکھ کر آؤ۔"

ترلوچن اُٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دُھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا "یہ میاں بھائی ہے۔۔۔۔۔ لیکن بہت دادا قسم کا۔۔۔۔۔۔ میں اسے سکھ کہا کرتی ہُوں۔"

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے۔۔۔۔۔۔ موذیل نے اطمینان کا سانس لیا —— لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خُون اس کے مُنہ سے بہہ نکلا "اوہ ڈیم اٹ۔۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہُوئی کلائی سے اپنا مُنہ پُونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہُوئی "آل رائٹ

ڈارلنگ ——— بائی بائی۔"

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی "لے جاؤ اس کو ——— اپنے اس مذہب کو۔" اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا

('نمرود کے کنارے' سے)

"میرا اندازہ ہے کہ جب تیسری منزل کھڑی کی جائے گی تو ساری بلڈنگ اڑا اڑا دھڑام گر پڑے گی، کیونکہ مصالحہ ہی میں نے ایسا لگوایا ہے، اس وقت تین سو مزدور کام پر لگے ہوں گے، خدا کے گھر سے مجھے پوری پوری امید ہے کہ یہ سب کے سب شہید ہو جائیں گے، لیکن اگر کوئی بچ گیا تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ پرلے درجے کا گناہگار ہے۔"

(شہید ساز ۔۔۔ نمرود کی خدائی)

کھول دو

امرتسر سے اسپیشل ٹرین دوپہر دو بجے کو چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی راستے میں کئی آدمی مارے گئے۔ متعدد زخمی ہوئے اور کچھ اِدھر اُدھر بھٹک گئے۔ صبح دس بجے ـــــ کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک متلاطم سمندر دیکھا تو اس کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہوگئیں۔

وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یُوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا، لیکن بُوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا کوئی اسے دیکھتا تو خیال کرتا کہ وُہ کسی گہری فکر میں غرق ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ اس کے ہوش و حواس شل تھے۔ اس کا سارا وجُود خلاء میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سُورج سے ٹکرائیں۔ تیز روشنی اس کے وجُود کے رگ و پے میں اُتر گئی اور وہ جاگ اُٹھا اُوپر تلے اس کے دماغ میں کئی تصویریں دوڑ گئیں لُوٹ ـــــ آگ ـــــ بھاگ دوڑ ـــــ اسٹیشن ـــــ گولیاں ـــــ رات اور سکینہ ـــــ سراج الدین ایک دم اُٹھ

کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانی سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔

پورے تین گھنٹے وہ سکینہ سکینہ پکارتا کیمپ کی خاک چھانتا رہا۔ مگر اسے اپنی جوان اکلوتی بیٹی کا کوئی پتہ نہ ملا۔ چاروں طرف ایک دھاندلی سی مچی ہوئی تھی...... کوئی اپنا بچہ ڈھونڈ رہا تھا، کوئی ماں، کوئی بیوی اور کوئی بیٹی...... سراج الدین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا اور حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی لیکن سوچتے سوچتے اس کا دماغ سکینہ کی ماں کی لاش پر جم جاتا جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں اس سے آگے وہ اور کچھ نہ سوچ سکتا۔

سکینہ کی ماں مر چکی تھی۔ اس نے سراج الدین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا۔ لیکن سکینہ کہاں تھی جس کے متعلق اس کی مرتی ہوئی ماں نے کہا تھا "مجھے چھوڑ دو اور سکینہ کو لے کر جلدی یہاں سے بھاگ جاؤ۔" سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی۔ دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔ سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ اسے اٹھانے کے لئے اس نے رکنا چاہا تھا۔ مگر سکینہ نے چلا کر کہا تھا "اباجی —— چھوڑیئے" لیکن اس نے دوپٹہ اٹھا لیا تھا ...... یہ سوچتے سوچتے اس نے اپنے کوٹ کی ابھری جیب کی طرف دیکھا اور اس میں ہاتھ ڈال کر ایک کپڑا نکالا —— سکینہ کا وہی دوپٹہ تھا...... لیکن سکینہ کہاں تھی؟

سراج الدین نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر بہت زور دیا مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا...... کیا وہ سکینہ کو اسٹیشن تک لے آیا تھا......؟ کیا وہ اس کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار تھی؟ راستے میں جب گاڑی روکی گئی تھی اور بلوائی اندر گھس آئے تھے۔ تو کیا وہ بے ہوش ہو گیا تھا جو وہ سکینہ کو اٹھا لے گئے؟

سراج الدین کے دماغ میں سوال ہی سوال تھے جواب کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کو

ہمدردی کی ضرورت تھی۔ ...... سراج الدین نے رونا چاہا مگر اس کی آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ آنسو نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

چھ روز کے بعد جب حالات کس قدر درست ہوئے تو سراج الدین ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کو تیار تھے۔ آٹھ نوجوان تھے جن کے پاس لاری تھی بندوقیں تھیں۔ سراج الدین نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا۔

گورا رنگ اور بہت ہی خوبصورت ہے .... مجھ پر نہیں اپنی ماں پر تھی ...... عمر سترہ برس کے قریب ہے .... آنکھیں بڑی بڑی ...... بال سیاہ، داہنے گال پر موٹا سا تل .... میری اکلوتی لڑکی ہے ...... ڈھونڈ لاؤ تمہارا خدا بھلا کرے۔"

رضا کار نوجوانوں نے بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے سراج الدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہوئی تو چند ہی دنوں میں اس کے پاس ہو گی۔

آٹھوں نوجوانوں نے کوشش کی۔ جان ہتھیلیوں پر رکھ کر وہ امرتسر گئے۔ کئی عورتوں، کئی مردوں اور کئی بچوں کو نکال نکال کر انہوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا۔ دس روز گذر گئے مگر انہیں سکینہ کہیں نہ ملی۔

ایک روز وہ اس خدمت کے لیئے لاری پر امرتسر جا رہے تھے کہ چھہرٹہ کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی۔ لاری کی آواز سن کر وہ بدکی اور بھاگنا شروع کر دیا۔ رضا کاروں نے موٹر روکی اور سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے ایک کھیت میں انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ دیکھا تو بہت خوبصورت تھی۔ داہنے گال پر موٹا تل تھا۔ ایک لڑکے نے اس سے کہا "گھبراؤ نہیں —— کیا تمہارا نام سکینہ ہے؟" —— لڑکی کا رنگ اور بھی زرد ہو گیا، لیکن جب تمام لڑکوں نے اسے دم دلاسا دیا تو اس کی وحشت دور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج الدین کی بیٹی سکینہ ہے۔ آٹھوں رضا کار

نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی، اُسے کھانا کھلایا، اسے دُودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا۔ ایک نے اپنا کوٹ اُتار کر اسے دے دیا کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت اُلجھن محسوس کر رہی تھی اور بار بار اپنے سینے کو باہوں سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کئی دن گذر گئے ـــــ سراج الدین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکر کاٹتا رہتا لیکن کہیں سے بھی اس کی بیٹی کا پتہ نہ چلا۔ رات کو وہ بہت دیر تک ان رضاکاروں کی کامیابی کے لئے دُعائیں مانگتا رہتا۔ جنہوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اگر سکینہ زندہ ہُوئی تو چند ہی دنوں میں وہ اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔

ایک روز سراج الدین نے کیمپ میں ان نوجوان رضاکاروں کو دیکھا۔ لاری میں بیٹھے تھے سراج الدین بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا۔ لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پُوچھا: "بیٹا میری سکینہ کا پتہ چلا؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا "چل جائے گا چل جائے گا" اور لاری چل دی۔

سراج الدین نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کے لئے دُعا مانگی اور اس کا جی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

شام کے قریب کیمپ میں جہاں سراج الدین بیٹھا تھا اس کے پاس ہی کچھ گڑبڑ سی ہُوئی، چار آدمی کچھ اٹھا کر لا رہے تھے، اس نے دریافت کیا تو معلوم ہُوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بے ہوش پڑی تھی لوگ اسے اُٹھا کر لائے ہیں۔ سراج الدین ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال والوں کے حوالے کیا اور چلے گئے۔

کچھ دیر وہ ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہُوئے لکڑی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔ سراج الدین چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا اس کی طرف بڑھا ـــــ

کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی سراج الدین نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا۔ اور چلایا۔ "سکینہ!"

ڈاکٹر، جس نے کمرے میں روشنی کی تھی سراج الدین سے پوچھا۔ "کیا ہے"؟

سراج الدین کے حلق سے صرف اس قدر نکلا۔ "جی میں ــــ جی میں اس کا باپ ہوں!"

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔ اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا۔ "کھڑکی کھول دو۔"

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش ہوئی اس نے بے جان ہاتھوں سے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔ بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا: "زندہ ہے ــــ میری بیٹی زندہ ہے"۔ ــــ ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینہ میں غرق ہو گیا ــــ

('نمرود کی خدائی' سے)

"موسیقی خرافات بھی ختم ہو چکی ہے، الحمدللہ! قوالی ہے، سنیئے اور سر دھنیئے حال کھیلئے، ہُو حق کے نعرے لگائیے اور ثواب حاصل کریں...... ایک اور لعنت مصوّری کی بھی تھی، اب ختم ہو چکی، مصوروں کی اُنگلیاں قلم کر دی گئی ہیں، تاکہ وہ فحش تصاویر بنا کر لوگوں کے اخلاق خراب کرنے کے مرتکب نہ ہوں...... سچ پُوچھیے تو اب وہ خوفناک حِس ہی مِٹ چُکی ہے، جسے طلبِ حسن کہتے ہیں، تخلیقِ حُسن کی بات تو الگ رہی۔"

("اللہ کا بڑا فضل ہے" ــــ اُوپر، نیچے اور درمیان)

ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے۔ یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں اُنھیں پاکستان پہنچا دیا جائے۔ اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں اُنھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہرحال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق اِدھر اُدھر اُونچی سطح کی کانفرنسیں ہُوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لئے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے وہیں رہنے دیئے گئے تھے۔ جو باقی تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے۔ اس لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہُوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں سرحد پر پہنچا دیئے گئے۔

اُدھر معلوم نہیں۔ لیکن اِدھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز

باقاعدگی کے ساتھ "زمیندار" پڑھتا تھا۔ اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا۔
"مولبی صاحب، یہ پاکستان کیا ہوتا ہے"۔ تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا۔
"ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں"۔
یہ جواب سُن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دُوسرے سکھ پاگل سے پُوچھا "سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے —— ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی"۔

دُوسرا مُسکرایا "مجھے تو ہندستوڑوں کی بولی آتی ہے —— ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں ——"

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مُسلمان پاگل نے "پاکستان زندہ باد" کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہُوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مُلک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے —— یہ کہاں ہے۔ اس کا محل وقوع کیا ہے۔ اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پُوری طرح ماؤف نہیں ہُوا تھا۔ اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اور اگر وہ پاکستان میں ہیں تو

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہُوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اُترنے کو کہا تو وہ اور اُوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا۔ تو اس نے کہا ——— میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ کہ پاکستان میں ——— میں اس درخت پر ہی رہوں گا۔"

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اُترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم ایس سی پاس ریڈیو انجینئر میں جو مُسلمان تھا اور دُوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ باغ کی ایک خاص روش پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا۔ یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اُتار کر دفعدار کے حوالے کر دیئے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مُسلمان پاگل نے جو مُسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا۔ اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے۔ مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا جب اس نے سنا کہ امرتسر ہندوستان میں چلا گیا ہے تو اُسے بہت دُکھ ہُوا۔ اسی شہر کی

ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ گو اس نے وکیل کو ٹھکرا دیا تھا مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ اُن تمام ہندو اور مُسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا۔ جنہوں نے مل کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے ------ اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دِل بُرا نہ کرے۔ اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اس کا خیال تھا کہ امرت سر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو معلوم ہُوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو اُن کو بہت صدمہ ہُوا۔ وہ چھُپ چھُپ کر گھنٹوں آپس میں اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حثیت کس قسم کی ہو گی۔ یورپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے داخل ہُوئے پندرہ برس ہو چُکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔ "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی مُنگ دی دال آف دی لالٹین"۔ دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لئے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سُوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھُول گئی تھیں مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجُود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ

غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب
دیتا: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی مُنگ دی وال آف دی پاکستان گورنمنٹ"
لیکن بعد میں آف دی پاکستان گورنمنٹ کی جگہ اوف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ
نے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے
جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان
میں جو بتلانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ
پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے۔ کیا پتا ہے کہ لاہور جو
اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن
جائے اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں
کسی دن سرے سے غائب ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا
تھا اس لئے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے۔ جس کے باعث اس کی شکل
بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے
جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے وہ اس کے متعلق اتنا
جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا۔
کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے
باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لئے لوگ آتے تھے اور اس کی خیریت دریافت
کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان ہندوستان
کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم

نہیں تھا کہ دن کونسا ہے، مہینہ کونسا ہے، یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لئے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آرہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو کبھی استعمال نہیں کرتا تھا نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین" کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہوگئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی پہلے تو اسے اپنے آپ پتا چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں۔ پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہوگئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لئے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً اسے بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے

حسبِ عادت قہقہہ لگایا اور کہا "پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا"۔

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو مگر وہ بہت مصروف تھا۔ اس لئے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آکر وہ اس پر برس پڑا "اوپڑ دی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی مُنگ دال آف واہے گوروجی دا خالصہ اینڈ واہے گوروجی کی فتح ——— جو بولے سو نہال، ست سری اکال"۔

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو ——— سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا ملاقات کے لئے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا۔ اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا "یہ تم سے ملنے آیا ہے ——— تمہارا دوست فضل دین ہے"۔

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی ——— تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے تھے ——— مجھ سے جتنی مدد ہو سکی، میں نے کی ——— تمہاری بیٹی روپ کور۔۔۔۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا ——— بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا "بیٹی روپ کور"

فضل نے رُک رُک کر کہا "ہاں۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔ وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے ——— ان کے ساتھ چلی گئی تھی"۔

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع "انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ

تمھاری خیر خیریت پوچھتا رہوں ـــــ اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو ـــــ بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا ـــــ اور بہن امرت کور سے بھی .... بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے ـــــ دو بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے ـــــ دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی .... اور .... میرے لائق جو خدمت ہو، کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں .... اور یہ تمھارے لئے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔"

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟" فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا "کہاں ہے ـــــ وہیں ہے جہاں تھا۔"

بشن سنگھ نے پھر پوچھا "پاکستان یا ہندوستان میں؟"

"ہندوستان میں ـــــ نہیں نہیں پاکستان میں۔" فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا "اوپڑ دی گڑگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر فٹے مُنہ!"

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں جب لاہور کے پاگل خانے سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بورڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل

ہو جاتا تھا۔ کیونکہ اِدھر اُدھر بھاگ اُٹھتے تھے، جو ننگے تھے ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جُدا کر دیتے ـــــ کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی ـــــ پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا۔ اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی۔ اس لیے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُنھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے۔ "پاکستان زندہ باد" اور "پاکستان مُردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا، کیونکہ بعض پاگل سکھوں کو یہ نعرے سُن کر طیش آ گیا تھا۔

بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پُوچھا "ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ پاکِستان میں یا ہندوستان میں؟"

متعلقہ افسر ہنسا "پاکستان میں"

یہ سُن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اُسے پکڑ لیا اور دُوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے اِنکار کر دیا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے ـــــ اور زور زور سے چلانے لگا۔ "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان"

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے ـــــ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا۔ مگر وہ نہ مانا جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا۔ اس لیئے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا

رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی ــــ اِدھر سے اُدھر کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ اِدھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا ــــ اِدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

(’پھندنے‘ سے)

پھولوں کی سازش

باغ میں جتنے پھول تھے سب کے سب باغی ہو گئے۔ گلاب کے سینے میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کی ایک ایک رگ آتشیں جذبہ کے تحت پھڑک رہی تھی۔ ایک روز اس نے اپنی کانٹوں بھری گردن اُٹھائی اور غور وفکر کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہُوا۔

"کسی کو کوئی حق حاصل نہیں کہ ہمارے پسینے سے اپنے عیش کا سامان مہیا کرے ــــ ہماری زندگی کی بہاریں ہمارے لیئے ہیں اور ہم اس میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرسکتے!"

گلاب کا مُنہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ اُس کی پنکھڑیاں تھر تھرا رہی تھیں۔ چنبیلی کی جھاڑی میں تمام کلیاں یہ شور سُن کر جاگ اُٹھیں اور حیرت میں ایک دُوسرے کا مُنہ تکنے لگیں۔ گلاب کی مردانہ آواز پھر بلند ہُوئی۔

"ہر ذی رُوح کو اپنے حقوق کی نگرانی کا حق حاصل ہے۔ اور ہم پھول اس سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ ہمارے قلوب زیادہ نازک اور حساس ہیں۔ گرم ہوا کا ایک جھونکا ہماری نیلی رنگت کو جلا کر خاکستر کر سکتا ہے اور شبنم کا ایک بے مقدار قطرہ ہماری پیاس بُجھا سکتا ہے۔ کیا ہم اُس کانے مالی کے کھُردرے ہاتھوں کو برداشت کر سکتے ہیں۔ جس پر موسموں کے تغیر و تبدل

کا کچھ اثر ہی نہیں ہوتا؟"

مرتیل کے پھول چلائے "ہرگز نہیں" لالہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور کہنے لگا۔" اس کے کے ظلم سے میرا سینہ داغدار ہو رہا ہے۔ میں پہلا پھول ہوں جو اس جلّاد کے خلاف بغاوت کا رُخ جھنڈا بلند کرے گا۔"

یہ کہہ کر وہ غصہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔

چنبیلی کی کلیاں متحیر تھیں کہ شور کیوں بلند ہو رہا ہے۔ ایک کلی ناز کے ساتھ گلاب کے پودے کی طرف جھکی اور کہنے لگی "تم نے میری نیند خراب کر دی ہے۔ آخر گلا پھلا پھلا کر کیوں چلّا رہے ہو؟"

گلخیرد جو دُور کھڑا گلاب کی قائدانہ تقریر پر غور کر رہا تھا بولا "قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے۔ گو ہم ناتواں پھول ہیں لیکن اگر ہم سب مل جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی جان کے دشمن کو پیس کر رکھ دیں۔ ہماری پتیاں اگر خوشبو پیدا کرتی ہیں تو وہ زہریلی گیس بھی تیار کر سکتی ہیں —— بھائیو! گلاب کا ساتھ دو اور اپنی فتح سمجھو۔"

یہ کہہ کر اُس نے اخوت کے جذبے کے ساتھ ہر پھول کی طرف دیکھا۔

گلاب کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چنبیلی کی کلی نے اپنے مرمریں جسم پر ایک تھرتھری پیدا کرتے ہوئے کہا "یہ سب بیکار باتیں ہیں........ آؤ تم مجھے شعر سناؤ، میں آج تمہاری گود میں سونا چاہتی ہوں...... تم شاعر ہو، میرے پیارے آؤ ہم بہار کے ان خوشگوار دنوں کو ایسی فضول باتوں میں ضائع نہ کریں اور اُس دُنیا میں چلیں جہاں نیند ہی نیند ہے...... میٹھی اور راحت بخش نیند!"

گلاب کے سینے میں ایک ہیجان برپا ہو گیا، اس کی نبض کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ وہ کسی اتھاہ گہرائی میں اُتر رہا ہے۔

اُس نے کلی کی گفتگو کے اثر کو دُور کرنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔" نہیں میں میدانِ جنگ

میں اُترنے کی قسم کھا چکا ہوں۔ اب یہ تمام ارمان میرے لئے مہمل ہیں۔"

کلی نے اپنے لچکیلے جسم کو بل دے کر خواب گوں لہجہ میں کہا "آہ، میرے پیارے گلاب ایسی باتیں نہ کرو مجھے وحشت ہوتی ہے....... چاندنی راتوں کا خیال کرو...... جب میں اپنا لباس اُتار کر اس نُورانی فوارے کے نیچے نہاؤں گی تو تمہارے گالوں پر سُرخی کا اُتار چڑھاؤ مجھے کتنا پیارا معلوم ہوگا اور تم میرے سیمیں لب کس طرح دیوانہ وار چومو گے..... چھوڑو ان فضول باتوں کو میں تمہارے کاندھے پر سر رکھ کر سونا چاہتی ہوں۔"

اور چنبیلی کی نازک ادا کلی گلاب کے تمتمائے ہوئے گال کے ساتھ لگ کر سوگئی ---- گلاب مدہوش ہو گیا۔ چاروں طرف سے ایک عرصہ تک دُوسرے پھولوں کی صدائیں بلند ہوتی رہیں مگر گلاب نہ جاگا...... ساری رات وہ مخمور رہا۔

صُبح کا نا مالی آیا۔ اس نے گلاب کے پھُول کی ٹہنی کے ساتھ چنبیلی کی کلی چمٹی ہُوئی پائی۔ اس نے اپنا کھُردرا ہاتھ بڑھایا اور دونوں کو توڑ لیا......

('دھواں' سے)

"سب نے بیک زبان ہو کر کہا۔" قطعاً نہیں، ہمیں محکمہ جنگلات
کے افسر پر پورا بھروسہ ہے، اس لئے کہ وہ سچ بولنے کا حلف
اُٹھا چکا ہے" ——— لڑکے نے پوچھا۔ "کیا یہ حلف جھوٹا نہیں
ہو سکتا؟" جواب ملا۔ "ہرگز نہیں، تم سازشی ہو، ففتھ کالمسٹ
ہو، کمیونسٹ ہو، غدار ہو، ترقی پسند ہو ——— سعادت حسن منٹو ہو۔"

("شیر آیا، شیر آیا دوڑنا" ——— نمرود کی خدائی)

سڑک کے کنارے

"یہی دن تھے ـــ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔ دُھلا ہُوا، نِتھرا ہُوا ـــ اور دُھوپ بھی ایسی ہی کنکنی تھی ـــ سہانے خوابوں کی طرح۔ مٹی کی باس بھی ایسی ہی تھی جیسی کہ اس وقت میرے دل و دماغ میں رچ رہی ہے..... اور میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے اپنی پھڑپھڑاتی ہُوئی رُوح اس کے حوالے کر دی تھی۔"

"اس نے مجھ سے کہا تھا..... تم نے مجھے جو یہ لمحات عطا کئے ہیں یقین جانو میری زندگی ان سے خالی تھی ـــ جو خالی جگہیں تم نے آج میری ہستی میں پُر کی ہیں تمہاری شکرگزار ہیں۔ تم میری زندگی میں نہ آتیں تو شاید وہ ہمیشہ اُدھوری رہتی..... میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تم سے اور کیا کہوں..... میری تکمیل ہو گئی ہے۔ ایسے مکمل طور پر کہ محسوس ہوتا ہے مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں رہی..... اور وہ چلا گیا ـــ ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔"

"میری آنکھیں روئیں ـــ میرا دل رویا..... میں نے اس کی منت سماجت کی۔ اس سے لاکھ مرتبہ پُوچھا کہ میری ضرورت اب تمہیں کیوں نہیں رہی..... جب کہ تمہاری ضرورت ـــ اپنی تمام شدتوں کے ساتھ اب شروع ہُوئی ہے۔ ان لمحات کے بعد جنہوں نے بقول تمہارے، تمہاری ہستی کی خالی جگہیں پُر کی ہیں۔"

— اس نے کہا۔ تمہارے وجود کے جس جس ذرے کی میری ہستی کی تعمیر و تکمیل کو ضرورت تھی، یہ لمحات چن چن کر دیتے رہے ...... اب کہ تکمیل ہو گئی ہے۔ تمہارا اور میرا رشتہ خود بخود ختم ہو گیا ہے۔"

کس قدر ظالمانہ لفظ تھے ...... مجھ سے یہ پتھراؤ برداشت نہ کیا گیا ...... میں چیخ چیخ کر رونے لگی ..... مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا ..... میں نے اس سے کہا "یہ ذرے جن سے تمہاری ہستی کی تکمیل ہوئی ہے، میرے وجود کا ایک حصہ تھے — کیا ان کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں — کیا میرے وجود کا بقایا حصہ ان سے اپنا ناطہ توڑ سکتا ہے ..... تم مکمل ہو گئے ہو ...... لیکن مجھے ادھورا کر کے ...... کیا میں نے اسی لئے تمہیں اپنا معبود بنایا تھا؟"

اس نے کہا ـ بھونرے، پھولوں اور کلیوں کا رس چوس چوس کر شہد کشید کرتے ہیں، مگر وہ اس کی تلچھٹ تک بھی ان پھولوں اور کلیوں کے ہونٹوں تک نہیں لاتے ..... خدا اپنی پرستش کراتا ہے، مگر خود بندگی نہیں کرتا ...... عدم کے ساتھ خلوت میں چند لمحات بسر کر کے اس نے اپنے وجود کی تکمیل کی ..... لیکن اب عدم کہاں ہے ..... اس کی اب وجود کو کیا ضرورت ہے — وہ ایک ایسی ماں تھی جو وجود کو جنم دیتے ہی زچگی کے بستر پر فنا ہو گئی تھی۔"

عورت رو سکتی ہے .... دلیلیں پیش نہیں کر سکتی ..... اس کی سب سے بڑی دلیل اس کی آنکھ سے ڈھلکا ہوا آنسو ہے ...... میں نے اس سے کہا "دیکھو ..... میں رو رہی ہوں ..... میری آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں۔ تم جا رہے ہو تو جاؤ، مگر ان میں سے کچھ آنسوؤں کو اپنے رومال کے کفن میں لپیٹ کر ساتھ لیتے جاؤ ..... میں تو ساری عمر روتی رہوں گی ..... مجھے اتنا تو یاد رہے گا کہ چند آنسوؤں کے کفن دفن کا سامان تم نے بھی کیا تھا ..... مجھے خوش کرنے کے لئے!"

اس نے کہا "میں تمہیں خوش کر چکا ہوں ...... تمہیں اس ٹھوس مسرت سے ہمکنار

کر چکا ہُوں۔ جس کے تم سراب ہی دیکھا کرتی تھیں — کیا اس کا لطف اس کا کیف، تمہاری زندگی کے بقایا لمحات کا سہارا نہیں بن سکتا۔ تم کہتی ہو کہ میری تکمیل نے ادھورا کر دیا ہے — لیکن یہ ادھورا پن ہی کیا تمہاری زندگی کو متحرک رکھنے کے لئے کافی نہیں۔ ۔ ۔ ۔ میں مرد ہُوں — آج تم نے میری تکمیل کی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کل کوئی اور کرے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا وجُود کچھ ایسے آب و گل سے بنا جس کی زندگی میں ایسے کئی لمحات آئیں گے جب وہ خُود تشنۂ تکمیل سمجھے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور تم ایسی کئی عورتیں آئیں گی جو لمحات کی پیدا کی ہُوئی خالی جگہیں پُر کریں گی۔"

میں روتی رہی جھنجلاتی رہی۔

میں نے سوچا — یہ چند لمحات جو ابھی میری مٹھی میں تھے۔ ۔ ۔ ۔ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ میں ان لمحات کی مٹھی میں تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے کیوں خُود کو ان کے حوالے کر دیا — میں نے کیوں اپنی پھڑپھڑاتی رُوح ان کے مُنہ کھولے قفس میں ڈال دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس میں ذرا تھا۔ ایک لُطف تھا — ایک کیف تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تھا، ضرور تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ اس کے اور میرے تصادم میں تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن۔ ۔ ۔ ۔ یہ کیا کہ وہ ثابت و سالم رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور مجھ میں تریڑے پڑ گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کیا، کہ وہ اب میری ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ لیکن میں اور بھی شدّت سے اس کی ضرورت محسوس کرتی ہُوں — وہ طاقتور بن گیا ہے۔ میں نحیف ہو گئی ہُوں — یہ کیا کہ آسمان پر دو بادل ہم آغوش ہوں — ایک رو رو کر برسنے لگا، دُوسرا بجلی کا کوندا بن کر اس بارش سے کھیلتا، کڑکڑ کرنے لگا تا بھاگ جائے۔ ۔ ۔ ۔ یہ کس کا قانُون ہے؟ — آسمانوں کا؟ — زمینوں کا۔ ۔ ۔ ۔ یا ان کے بنانے والوں کا؟

میں سوچتی رہی اور جھنجلاتی رہی۔

دو رُوحوں کا سمٹ کر ایک ہو جانا اور ایک ہو کر والہانہ وسعت اختیار کر جانا —

کیا یہ سب شاعری ہے؟۔ ۔ ۔ ۔ نہیں دو رُوحیں سمٹ کر ضرور اس ننھے سے نقطے پر پہنچتی ہیں جو پھیل کر کائنات بنتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس کائنات میں ایک رُوح کیوں

کبھی کبھی گھائل چھوڑ دی جاتی ہے۔۔۔۔۔ کیا اس قصور پر کہ اس نے دُوسری رُوح کو اس ننھے سے نقطے پر پہنچنے میں مدد دی تھی۔

یہ کیسی کائنات ہے۔

یہی دن تھے ــــ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔۔۔۔۔ اور دُھوپ بھی ایسی ہی کنکنی تھی۔۔۔۔۔ اور میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے اپنی پھڑپھڑاتی ہُوئی رُوح اس کے حوالے کر دی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ موجُود نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔ بجلی کا کوندا بن کر جانے وہ کن بدلیوں کی گریہ وزاری سے کھیل رہا ہے۔۔۔۔۔۔ اپنی تکمیل کر کے چلا گیا۔۔۔۔۔ ایک سانپ تھا جو مجھے ڈس کر چلا گیا۔۔۔۔ لیکن اب اس کی چھوڑی ہُوئی لکیر کیوں میرے پیٹ میں کروٹیں لے رہی ہے۔۔۔۔۔ کیا یہ میری تکمیل ہو رہی ہے؟۔

نہیں، نہیں۔۔۔۔۔ یہ کیسے تکمیل ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ یہ تو تخریب ہے۔۔۔۔۔

لیکن یہ میرے جسم کی خالی جگہیں کیوں پُر ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔ یہ جو گڑھے تھے کس ملبے سے پُر کئے جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ میری رگوں میں کیسی سرسراہٹیں دوڑ رہی ہیں ــــ میں سمٹ کر اپنے پیٹ میں کس ننھے سے نقطے پر پہنچنے کے لئے پیچ و تاب کھا رہی ہُوں۔۔۔۔ میری ناؤ ڈوب کر اب کن سمندروں میں اُبھرنے کے لئے اُٹھ رہی ہے۔۔۔۔۔؟

یہ میرے اندر دہکتے ہُوئے چُولھوں پر کس مہمان کے لِئے دُودھ گرم کیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔

یہ میرا دل میرے خُون کو دھنک دھنک کر کس کے لئے نرم و نازک رضائیاں تیار کر رہا ہے۔ یہ میرا دماغ میرے خیالات کے رنگ برنگ دھاگوں سے کِس کے لِئے ننھی مُنّی پوشاکیں بن رہا ہے؟

میرا رنگ کس کے لئے نکھر رہا ہے۔۔۔۔۔۔ میرے انگ انگ اور رُوم رُوم میں پھنسی ہُوئی ہچکیاں لوریوں میں کیوں تبدیل ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔

یہی دن تھے ــــ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے۔۔۔

لیکن یہ آسمان اپنی بلندیوں سے اُتر کر کیوں میرے پیٹ میں تن گیا ہے۔۔۔۔۔ اس کی نیلی نیلی

آنکھیں کیوں میری رگوں میں دوڑتی پھرتی ہیں ؟

میرے سینے کی گولائیوں میں مسجدوں کے محرابوں ایسی تقدیس کیوں آرہی ہے۔ ؟

نہیں، نہیں ۔۔۔۔ یہ تقدیس کچھ بھی نہیں ـــــ میں ان محرابوں کو ڈھادوں گی ۔۔۔

میں اپنے اندر تمام چولھے سرد کر دوں گا جن پر بن بلائے مہمان کی خاطرداریاں چڑھی ہیں ـــــ

میں اپنے خیالات کے تمام رنگ برنگ دھلگے آپس میں اُلجھادوں گی ۔۔۔۔۔

یہی دن تھے ـــــ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیساکہ آج ہے ۔۔۔

لیکن میں وہ دن کیوں یاد کرتی ہوں، جن کے سینے پر سے وہ اپنے نقشِ قدم بھی اُٹھاکر لے گیا تھا ۔۔۔۔۔

لیکن یہ ۔۔۔۔ یہ نقشِ قدم کس کا ہے ـــــ یہ جو میرے پیٹ کی گہرائیوں میں تڑپ رہا ہے ۔۔۔۔ ؟ کیا یہ میرا جانا پہچانا نہیں ۔۔۔۔۔۔

میں اسے کھرچ دوں گی ۔۔۔۔۔ اسے مٹادوں گی ـــــ یہ رسولی ہے ـــــ پھوڑا ہے ـــــ بہت خوفناک پھوڑا۔

لیکن مجھے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ پھاہا ہے ۔۔۔۔ پھاہا ہے تو کس زخم کا ؟ ـــــ اس زخم کا جو وہ مجھے لگاکر چلا گیا تھا ؟ ـــــ نہیں نہیں ـــــ یہ تو ایسا لگتا ہے، کسی پیدائشی زخم کے لیے ہے ۔۔۔۔ ایسے زخم کے لیے جو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا ۔۔۔ جو میری کوکھ میں جانے کب سے سو رہا تھا۔

یہ کوکھ کیا ؟ ۔۔۔۔ فضول سی مٹی کی ہنڈکلھیا ـــــ بچوں کا کھلونا۔ میں اسے توڑ پھوڑ دوں گی لیکن یہ کون میرے کان میں کہتا ہے " یہ دنیا ایک چوراہا ہے ۔۔۔۔ اپنا بھانڈا کیوں اس میں پھوڑتی ہے ۔۔۔۔ یاد رکھ تجھ پر انگلیاں اُٹھیں گی۔

انگلیاں ۔۔۔ اُدھر کیوں نہ اُٹھیں گی، جدھر وہ اپنی ہستی مکمل کر کے چلا گیا تھا ـــــ کیا ان انگلیوں کو وہ راستہ معلوم نہیں ۔۔۔۔ یہ دنیا ایک چوراہا ہے ۔۔۔ لیکن اس

وقت وہ مجھے ایک دوراہے پر چھوڑ کر چلا گیا تھا ـــــ اِدھر بھی ادھورا پن۔ اُدھر بھی ادھورا پن ـــــ اِدھر بھی آنسو، اُدھر بھی آنسو۔

لیکن یہ کس کا آنسو، میرے سیپ میں موتی بن رہا ہے ـــــ یہ کہاں بندھے گا؟

اُنگلیاں اُٹھیں گی ـــــ جب سیپ کا منہ کھلے گا اور موتی پھسل کر باہر چوراہے میں گر پڑے گا تو انگلیاں اُٹھیں گی ـــــ سیپی کی طرف بھی اور موتی کی طرف بھی...... اور یہ انگلیاں سنپولیا بن بن کر ان دونوں کو ڈسیں گی اور اپنے زہر سے ان کو نیلا کر دیں گی۔

آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے...... یہ گر کیوں نہیں پڑتا...... وہ کون سے ستون ہیں جو اس کو تھامے ہوئے ہیں...... کیا اس دن جو زلزلہ آیا تھا وہ ان ستونوں کی بنیادیں ہلا دینے کے لئے کافی نہیں تھا...... یہ کیوں اب تک میرے سر کے اُوپر اسی طرح تنا ہُوا ہے؟

میری رُوح پسینے میں غرق ہے...... اس کا ہر مسام کھلا ہُوا ہے۔ چاروں طرف آگ دہک رہی ہے...... میرے اندر کٹھالی میں سونا پگھل رہا ہے...... دھونکنیاں چل رہی ہیں۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ سونا، آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح اُبل رہا ہے ـــــ میری رگوں میں نیلی آنکھیں دوڑ دوڑ کر ہانپ رہی ہیں...... گھنٹیاں بج رہی ہیں...... کوئی آ رہا ہے...... کوئی آ رہا ہے۔ بند کر دو ـــــ بند کر دو کواڑ......

کٹھالی اُلٹ گئی ہے...... پگھلا ہُوا سونا بہہ رہا ہے...... گھنٹیاں بج رہی ہیں...... وہ آ رہا ہے...... میری آنکھیں مند رہی ہیں...... نیلا آسمان گدلا ہو کر نیچے آ رہا ہے......

یہ کس کے رونے کی آواز ہے...... اسے چُپ کراؤ...... اس کی چیخیں میرے دل پر ہتھوڑے مار رہی ہیں ـــــ چُپ کراؤ ـــــ اُسے چُپ کراؤ ـــــ اسے چُپ کراؤ ـــــ میں گود بن رہی ہُوں...... میں کیوں گود بن رہی ہُوں......

میری باہیں کُھل رہی ہیں۔ چُولھوں پہ دُودھ اُبل رہا ہے ـــــ میرے سینے کی گولائیاں

پیالیاں بن رہی ہیں .... لاؤ اس گوشت کے لوتھڑے کو میرے دل کے دھڑکتے ہوئے خُون کے نرم نرم گالوں میں لٹا دو ......

مت چھینو ــــ مت چھینو اسے ...... مجھ سے جُدا نہ کرو۔ خُدا کے لئے مجھ سے جُدا نہ کرو۔

انگلیاں ..... انگلیاں ..... اُٹھنے دو اُنگلیاں مجھے کوئی پروا نہیں ..... یہ دُنیا چوراہا ہے ..... پھوٹتے دو میری زندگی کے تمام بھانڈے ......

میری زندگی تباہ ہو جائے گی؟ ...... ہو جانے دو ...... مجھے میرا گوشت واپس دے دو ..... میری رُوح کا یہ ٹکڑا مجھ سے مت چھینو ..... تُم نہیں جانتے یہ کتنا قیمتی ہے۔ ..... نیا گوہر ہے جو مجھے ان چند لمحات نے عطا کیا ہے ..... ان چند لمحات نے جنہوں نے میرے وجُود کے کئی ذرّے چُن چُن کر کسی کی تکمیل کی تھی اور مجھے اپنے خیال میں ادھورا چھوڑ کے چلے گئے تھے ...... میری تکمیل آج ہُوئی ہے۔

مان لو ..... مان لو ..... میرے پیٹ کے خلاء سے پُوچھو ــــ میری دُودھ بھری ہُوئی چھاتیوں سے پُوچھو ــــ ان لوریوں سے پُوچھو، جو میرے انگ انگ اور روم روم میں تمام ہچکیاں سلا کر آگے بڑھ رہی ہیں ــــ ان جھولنوں سے پُوچھو جو میرے بازوؤں میں ڈالے جا رہے ہیں۔

میرے چہرے کی زردیوں سے پُوچھو جو گوشت کے اس لوتھڑے کے گالوں کو اپنی تمام سرخیاں چُساتی رہی ہیں ..... اُن کے سانسوں سے پوچھو۔ جو چوری چھپے اس کو اس کا حصّہ پہنچاتے رہے ہیں۔

انگلیاں ــــ اُٹھنے دو انگلیاں ..... میں اُنہیں کاٹ ڈالوں گی ..... شور مچے گا ..... میں یہ انگلیاں اُٹھا کر اپنے کانوں میں ٹھونس لوں گی ــــ میں گونگی ہو جاؤں گی، بہری ہو جاؤں گی، اندھی ہو جاؤں گی ..... میرا گوشت، میرے اشارے سمجھ لیا کرے گا ..... میں

اسے ٹٹول ٹٹول کر پہچان لیا کروں گی.......

مت چھینو...... مت چھینو اسے ــــ یہ میری کوکھ کی مانگ کا سیندھور ہے ــــ یہ میری ممتا کے ماتھے کی بندیا ہے...... میرے گناہ کا کڑوا پھل ہے؟ ــــ لوگ اس پر تھُو تھُو کریں گے؟...... میں چاٹ لوں گی یہ سب تھوکیں.... آنول سمجھ کر صاف کر دوں گی.... دیکھو میں ہاتھ جوڑتی ہُوں ــــ تمہارے پاؤں پڑتی ہُوں ــــ تمہارے پاؤں پڑتی ہُوں۔ میرے بھرے ہُوئے دُودھ کے برتن اوندھے نہ کرو..... میرے دل کے دھنکے ہُوئے خُون کے نرم نرم گالوں میں آگ نہ لگاؤ ــــ میری باہوں کے جُھولنوں کی رسیاں نہ توڑو ــــ میرے کانوں کو ان گیتوں سے محروم نہ کرو جو اس کے رونے میں مجھے سُنائی دیتے ہیں۔ مت چھینو مت چھینو..... مجھ سے جُدا نہ کرو ــــ خُدا کے لئے مجھے اس سے جُدا نہ کرو۔"

لاہور۔ ۱۲ر جنوری

دھوبی منڈی سے پُولیس نے ایک نوزائیدہ بچی کو سردی سے ٹھٹھرتے سڑک کے کنارے پڑی ہُوئی پایا اور اپنے قبضے میں لے لیا۔ کسی سنگدل نے بچی کی گردن کو مضبُوطی سے کپڑے میں جکڑ رکھا تھا اور عُریاں جسم کو پانی سے گیلے کپڑے میں باندھ رکھا تھا تاکہ وہ سردی سے مر جائے مگر وہ زندہ تھی۔ بچی بہت خوبصورت ہے۔ آنکھیں نیلی ہیں۔ اس کو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔

(سڑک کے کنارے)

فرشتہ

سُرخ کھردرے کمبل میں عطا اللہ نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور اپنی مندی ہُوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔ کمرے کی دبیز چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہُوئی تھیں۔ جن کے صحیح خدوخال نظر نہیں آتے تھے۔ ایک لمبا، بہت ہی لمبا، نہ ختم ہونے والا دالان تھا یا شاید کمرہ تھا جس میں دُھندلی دُھندلی روشنی پھیلی ہُوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ جگہ میلی ہو رہی تھی۔

دُور بہت دُور، جہاں شاید یہ کمرہ یا دالان ختم ہو سکتا تھا، ایک بہت بڑا بُت تھا جس کا دراز قد چھت کو پھاڑتا ہُوا باہر نکل گیا تھا۔ عطا اللہ کو اس کا صرف نچلا حصہ نظر آرہا تھا جو بہت پُرہیبت تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ موت کا دیوتا ہے جو اپنی ہولناک شکل دکھلانے سے قصداً گریز کر رہا ہے۔

عطا اللہ نے ہونٹ گول کر کے اور زبان پیچھے کھینچ کر اس پُرہیبت بُت کی طرف دیکھا اور سیٹی بجائی، بالکل اسی طرح جس طرح کُتّے کو بلانے کے لیے بجائی جاتی ہے۔ سیٹی کا بجنا تھا کہ اس کمرے یا دالان کی دُھندلی فضا میں ان گنت دُمیں لہرانے لگیں۔ لہراتے لہراتے یہ سب ایک بہت بڑے شیشے کے مرتبان میں جمع ہو گئیں جو غالباً اسپرٹ سے بھرا ہُوا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ مرتبان دُھندلی فضا میں بغیر کسی سہارے کے تیرتا، ڈولتا اس کی آنکھوں کے پاس پہنچ گیا۔ اب

وہ ایک چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں اسپرٹ کے اندر اس کا دل ڈبکیاں لگا رہا تھا اور دھڑکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

عطا اللہ کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی۔ اس مقام پر جہاں اس کا دل ہوا کرتا تھا، اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ رکھا اور بے ہوش ہو گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر کے بعد اسے ہوش آیا مگر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو کہرا غائب تھا۔ وہ دیو ہیکل بُت بھی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور برف کی طرح ٹھنڈا۔ مگر اس مقام پر جہاں اس کا دل تھا ایک آگ سی لگی ہوئی تھی —— اس آگ میں کئی چیزیں جل رہی تھیں۔ مگر اس کے گوشت پوست اور اس کی ہڈیوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا جھلس دینے والی تپش میں بھی وہ یخ بستہ تھا۔

اس نے ایک دم اپنے برفیلے ہاتھوں سے اپنی زرد رو بیوی اور سُوکھے کے مارے ہوئے بچوں کو اٹھایا اور پھینک دیا —— اب آگ کے اس الاؤ میں عرضیوں کے پلندے کے پلندے جل رہے تھے —— ہر زبان میں لکھی ہوئی عرضیاں۔ ان پر اس کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے دستخط، سب جل رہے تھے آواز پیدا کئے بغیر۔

آگ کے شعلوں کے پیچھے اُسے اپنا چہرہ نظر آیا۔ پسینے سے —— سرد پسینے سے تربتر۔ اس نے آگ کا ایک شعلہ پکڑا اور اس سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر ایک طرف پھینک دیا۔ الاؤ میں گرتے ہی یہ شعلہ بھیگے ہوئے اسفنج کی طرح رونے لگا —— عطا اللہ کو اس کی یہ حالت دیکھ کر بہت ترس آیا۔

عرضیاں جلتی رہیں اور عطا اللہ دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی زرد رو بیوی نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں گندھے ہوئے آٹے کا تھال تھا۔ جلدی جلدی اس نے پیڑے بنائے اور آگ میں ڈالنا شروع کر دیئے جو آنکھ جھپکنے کی دیر میں کوئلے بن کر سُلگنے لگے۔ انہیں دیکھ کر عطا اللہ کے پیٹ میں زور کا درد اُٹھا۔ جھپٹا مار کر اس نے تھال میں سے آخری پیڑا اٹھایا اور

منہ میں ڈال لیا۔ لیکن آٹا خشک تھا۔ ریت کی طرح۔ اس کا سانس رُکنے لگا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

اب اس نے ایک بے جوڑ خواب دیکھنا شروع کیا۔ ایک بہت بڑی محراب تھی جس پر جلی حروف میں یہ شعر لکھا تھا ؂

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اوّلیں پرسش نماز بود

وہ فوراً پتھریلے فرش پر سجدے میں گر پڑا۔ نماز بخشوانے کے لیے دُعا مانگنا چاہی۔ مگر بھوک اس کے معدے کو اس بُری طرح ڈسنے لگی کہ بلبلا اُٹھا۔ اتنے میں کسی نے بڑی بارعب آواز میں اُسے پکارا

"عطاء اللہ"

عطاء اللہ کھڑا ہو گیا ـــــ محرابوں کے پیچھے ـــــ بہت پیچھے اُونچے منبر پر ایک شخص کھڑا۔ مادر زاد برہنہ، اس کے ہونٹ ساکت تھے، مگر آواز آ رہی تھی۔

"عطاء اللہ! تم کیوں زندہ ہو؟ آدمی صرف اس وقت تک زندہ رہتا ہے، جب تک اسے کوئی سہارا ہو ـــــ ہمیں بتاؤ، کوئی ایسا سہارا ہے جس کا تمہیں سہارا ہو؟ ـــــ تم بیمار ہو ـــــ تمہاری بیوی آج نہیں تو کل بیمار ہو جائے گی۔ وہ جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، بیمار ہوتے ہیں ـــــ زندہ درگور ہوتے ہیں۔ اس کا سہارا تم ہو جو بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے ـــــ تمہارے بچے بھی ختم ہو رہے ہیں ـــــ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے خُود اپنے آپ کو ختم نہیں کیا۔ اپنے بچوں اور اپنی بیوی کو ختم نہیں کیا ـــــ کیا اس خاتمے کے لیے بھی تمہیں کسی کے سہارے کی ضرورت ہے ـــــ تم رحم و کرم کے طالب ہو ـــــ بے وقوف، کون تم پر رحم کرے گا۔ موت کو کیا پڑی ہے کہ وہ تمہیں مصیبتوں سے نجات دلائے۔ اس کے لیے یہ مصیبت کیا کم ہے کہ وہ موت ہے ـــــ کس کس کو آئے۔ ـــــ ایک صرف تم عطاء اللہ نہیں

ہو، تُم ایسے لاکھوں عطأ اللہ اس بھری دُنیا میں موجُود ہیں ـــــ جاؤ اپنی مصیبتوں کا عِلاج خُود کرو ـــ دو مریل بچوں اور ایک فاقہ زدہ بیوی کو ہلاک کرنا کوئی مُشکل کام نہیں۔ اس بوجھ سے ہلکے ہو جاؤ تو موت شرمسار ہو کر خُود بخُود تمہارے پاس چلی آئے گی۔"

عطأ اللہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگا ـــ "تم ـــ تُم سب سے بڑے ظالم ہو ـــ بتاؤ تُم کون ہو۔ اس سے پیشتر کہ میں اپنی بیوی اور بچوں کو ہلاک کروں، میں تمہارا خاتمہ کر دینا چاہتا ہُوں۔"

مادر زاد برہنہ شخص نے قہقہہ لگایا اور کہا "میں عطأ اللہ ہُوں ـــ غور سے دیکھو ـ کیا تم اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتے۔"

عطأ اللہ نے اس ننگ دھڑنگ آدمی کی طرف دیکھا اور اس کی گردن جُھک گئی ـــ وہ خود ہی تھا۔ بغیر لباس کے، اس کا خُون کھولنے لگا فرش میں سے اس نے اپنے بڑھے ہُوئے ناخنوں سے کھرچ کر ایک پتھر نکالا اور تان کر منبر کی طرف دیکھا ـــ اس کا سر چکرایا۔ ماتھے پہ ہاتھ رکھا تو اس میں سے لہُو نکل رہا تھا۔ وہ بھاگا ـــ پتھریلے صحن کو عبُور کر کے جب باہر نکلا تو ہجُوم نے اسے گھیر لیا۔ ہجُوم کا ہر فرد عطأ اللہ تھا۔ جس کا ماتھا لہُو لہان تھا۔

بڑی مشکلوں سے ہجوم کو چیر کر وہ باہر نکلا۔ ایک تنگ و تار سڑک پر دیر تک چلتا رہا۔ اس کے دونوں کناروں پر حشیش اور تھوہر کے پودے اُگے ہُوئے تھے۔ ان میں کہیں کہیں دوسری زہریلی بوٹیاں بھی تھیں۔ عطأ اللہ نے جیب سے بوتل نکال کر تھوہر کا عرق جمع کیا۔ پھر زہریلی بوٹیوں کے پتے توڑ کر اس میں ڈالے اور اُنہیں ہلاتا ہلاتا اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے کچھ فاصلے پر اس کا مکان تھا ـــ شکستہ اینٹوں کا ڈھیر۔

ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہُوا ـــ سامنے طاق میں مٹی کے تیل کی کپی سے کافی روشنی نکل رہی تھی۔ اس مٹیالی روشنی میں اس نے دیکھا کہ جھلنگی پلنگڑی پر اس کے دونوں مریل بچے مرے پڑے ہیں۔

عطاءاللہ کو بہت ناامیدی ہوئی۔ بوتل جیب میں رکھ کر جب وہ پلنگڑی کے پاس گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ پھٹی پرانی گدڑی جو اس کے بچوں پر پڑی ہے آہستہ آہستہ ہل رہی ہے عطاءاللہ بہت خوش ہوا ـــــ وہ زندہ تھے۔ بوتل جیب سے نکال کر وہ فرش پر بیٹھ گیا۔

دونوں لڑکے تھے۔ ایک چار برس کا دوسرا پانچ کا ـــــ دونوں بھوکے تھے، دونوں ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے۔ گدڑی ایک طرف ہٹا کر جب عطاءاللہ نے ان کو غور سے دیکھا تو اسے تعجب ہوا کہ اتنے چھوٹے بچے اتنی سوکھی ہڈیوں پر اتنی دیر سے کیسے زندہ رہیں۔ اس نے زہر کی شیشی ایک طرف رکھ دی اور انگلیوں سے ایک بچے کی گردن ٹٹولتے ـــــ ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔ ہلکی سی تڑاخ ہوئی اور اس بچے کی گردن ایک طرف لٹک گئی۔ عطاءاللہ بہت خوش ہوا کہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے کام تمام ہو گیا۔ اسی خوشی میں اس نے اپنی بیوی کو پکارا "جیناں! جیناں ـــــ ادھر آؤ۔ دیکھو میں نے کتنی صفائی سے رحیم کو مار ڈالا ہے ـــــ کوئی تکلیف نہیں ہوئی اس کو۔"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا ـــــ زینت کہاں ہے؟ ـــــ معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے ـــــ شاید بچوں کے لئے کسی سے کھانا مانگنے گئی ہو ـــــ یا ہسپتال میں اس کی خیریت دریافت کرنے ـــــ عطاءاللہ ہنسا ـــــ مگر اس کی ہنسی فوراً دب گئی۔ جب دوسرے بچے نے کروٹ بدلی اور اپنے مُردہ بھائی کو ہلانا شروع کیا۔ "رحیم ـــــ رحیم"

وہ نہ بولا تو اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ہڈیوں کی چھوٹی چھوٹی سیاہ پیالیوں میں اس کی آنکھیں چمکیں۔ "ابا ـــــ" آ گئے۔

عطاءاللہ نے ہولے سے کہا۔ ہاں کریم میں آ گیا۔

کریم نے اپنے استخوانی ہاتھ سے رحیم کو جھنجھوڑا۔ "اٹھو رحیم۔ ابا آ گئے ہسپتال سے۔"

عطاءاللہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ خاموش رہو ـــــ وہ سو گیا ہے۔"

کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ ہٹایا۔ کیسے سو گیا ہے ـــــ ہم دونوں نے ابھی تک کچھ

کھایا نہیں۔"

"تم جاگ رہے تھے۔"

"ہاں ابا۔"

"کیسے؟"

"میں سُلاتا ہُوں تمھیں۔" یہ کہہ کر عطاء اللہ نے اپنی سخت اُنگلیاں کریم کی گردن پر رکھیں اور اس کو مروڑ دیا۔ مگر تڑاخ کی آواز پیدا نہ ہُوئی۔

کریم کو بہت درد ہُوا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" عطاء اللہ حیرت زدہ تھا کہ اس کا یہ دُوسرا لڑکا اتنا سخت جان کیوں ہے۔

"کیا تم سونا نہیں چاہتے؟"

کریم نے اپنی گردن سہلاتے ہُوئے جواب دیا۔ "سونا چاہتا ہُوں ۔۔۔ کچھ کھانے کو دے دو ۔۔۔ سو جاؤں گا۔"

عطاء اللہ نے زہر کی شیشی اُٹھائی۔ "پہلے یہ دوا پی لو۔"

"اچھا۔" کریم نے اپنا مُنہ کھول دیا۔

عطاء اللہ نے ساری شیشی اس کے حلق میں انڈیل دی اور اطمینان کا سانس لیا۔

"اب تم گہری نیند سو جاؤ گے۔"

کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔ "ابا ۔۔۔ اب کچھ کھانے کو دو۔"

عطاء اللہ کو بہت کوفت ہُوئی۔ "تم مرتے کیوں نہیں؟"

کریم یہ سن کر سٹپٹا سا گیا۔ "کیا ابا؟"

"تم مرتے کیوں نہیں ۔۔۔ میرا مطلب ہے اگر تم مر جاؤ گے تو نیند بھی آجائے گی تمہیں۔"

کریم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا باپ کیا کہہ رہا ہے۔ "مارتا تو اللہ میاں ہے ابا۔"

اب عطاء اللہ کی سمجھ میں آیا کہ وہ کیا کہے۔ "مارا کرتا تھا کبھی ۔۔۔ اب اس نے یہ کام چھوڑ دیا ہے ۔۔۔ چلو اُٹھو۔"

پلنگڑی پر کریم تھوڑا سا اُٹھا تو عطا اللہ نے اسے اپنی گود میں لے لیا اور سوچنے لگا کہ وہ اللہ میاں کیسے بنے۔ ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر جب باہر گلی میں نکلا۔ اسے یُوں محسوس ہُوا جیسے آسمان اس پر جُھکا ہُوا ہے۔ اس میں جا بجا مٹی کے تیل کی کپیاں جل رہی تھیں۔ اللہ میاں خُدا جانے کہاں تھا۔۔۔ اور زینب بھی۔۔۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی تھی۔

کہیں سے کچھ مانگنے گئی ہو گی۔۔۔ عطا اللہ ہنسنے لگا۔ لیکن فوراً اسے خیال آیا کہ اسے اللہ میاں بننا تھا۔۔۔ سامنے موری کے پاس بہت سے پتھر پڑے تھے۔ ان پر وہ اگر کریم کو دے مارے تو۔

مگر اس میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ کریم اس کی گود میں تھا۔ اس نے کوشش کی کہ اسے اپنے بازوؤں میں اُٹھائے اور سر سے اُوپر لے جا کر پتھروں پر پٹک دے، مگر اس کی طاقت جواب دے گئی۔ اس نے کچھ سوچا اور اپنی بیوی کو آواز دی "جیناں۔۔۔ جیناں"

زینب معلوم نہیں کہاں ہے۔۔۔ کہیں وہ اس ڈاکٹر کے ساتھ تو نہیں چلی گئی جو ہر وقت اس سے اتنی ہمدردی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ وہ ضرور اس کے فریب میں آ گئی ہو گی۔ میرے لیے اس نے کہیں خود کو بیچ تو نہیں دیا۔

رات نصف سے زیادہ گذر چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا جب وہ اپنے وارڈ کے برآمدے میں پہنچا تو دو آوازیں سنائی دیں۔ ایک اس کی بیوی کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی "تم دغاباز ہو۔۔۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔۔۔ اس سے جو کچھ تمہیں ملا ہے تم نے اپنی جیب میں ڈال لیا ہے"

کسی مرد کی آواز سُنائی دی "تم غلط کہتی ہو۔۔۔ تم اس کو پسند نہیں آئیں۔ اس لیے وہ چلا گیا"

اس کی بیوی دیوانہ وار چلائی "بکواس کرتے ہو۔۔۔ ٹھیک ہے کہ میں دو بچوں کی ماں ہُوں۔۔۔ میرا وہ پہلا سا رنگ روپ نہیں رہا۔۔۔ لیکن وہ مجھے قبُول کر لیتا۔ اگر تم بھاگ نہ جاتے۔۔۔ تم بہت ظالم ہو۔۔۔ بڑے کٹھور ہو" اس کی آواز گلے میں رندھنے لگی "میں کبھی تمہارے ساتھ نہ چلتی۔۔۔ میں کبھی اس ذلت میں گرتی۔ اگر میرا خاوند بیمار اور میرے بچے کئی دنوں کے بھوکے نہ ہوتے۔۔۔ تم نے کیوں یہ ظلم کیا؟"

اس مرد نے جواب دیا۔" وہ — کوئی بھی نہیں تھا — میں خود تھا — جب تم میرے ساتھ چل پڑیں تو میں نے خود کو پہچانا — اور تم سے کہا کہ وہ چلا گیا ہے — وہ جس کے لئے میں تمہیں لایا تھا — مجھے معلوم ہے کہ تمہارا خاوند مر جائے گا — تمہارے بچے مر جائیں گے تم بھی مر جاؤ گی — لیکن......."

" لیکن کیا؟" — اس کی بیوی نے تیکھی آواز میں پوچھا۔

" میں مرتے دم تک زندہ رہوں گا — تم نے مجھے اس زندگی سے بچا لیا ہے جو موت سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتی — چلو آؤ — عطاءاللہ ہمیں بلا رہا ہے۔"

عطاءاللہ یہاں کھڑا ہے۔" عطاءاللہ نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔

دو سائے پلٹے — اس سے کچھ فاصلے پر وہ ڈاکٹر کھڑا تھا جو زینب سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کے منہ سے صرف اس قدر نکل سکا تھا۔" تم!"

" ہاں میں....... تمہاری سب باتیں سن چکا ہوں۔" یہ کہہ کر عطاءاللہ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔" جیناں — میں نے رحیم اور کریم دونوں کو مار ڈالا ہے — اب میں اور تم باقی رہ گئے ہیں۔"

زینب چیخی۔" مار ڈالا تم نے دونوں بچوں کو؟"

عطاءاللہ نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔" ہاں — انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی — میرا خیال ہے تمہیں بھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی — ڈاکٹر صاحب جو موجود ہیں۔"

ڈاکٹر کانپنے لگا — عطاءاللہ آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا۔" ایسا انجکشن دے دو کہ فوراً مر جائے۔"

ڈاکٹر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا بیگ کھولا اور سرنج میں زہر بھر کے زینب کے ٹیکہ لگا دیا۔ ٹیکہ لگتے ہی وہ فرش پر گری اور مر گئی۔ اس کی زبان پر آخری الفاظ "میرے بچے — میرے بچے" تھے مگر اچھی طرح ادا نہ ہو سکے۔ عطاءاللہ نے اطمینان کا سانس لیا۔" چلو یہ بھی ہو گیا — اب میں باقی رہ گیا ہوں۔"

"لیکن ..... لیکن میرے پاس زہر ختم ہو گیا ہے۔" ڈاکٹر کے لہجے میں لکنت تھی۔

عطا اللہ تھوڑی دیر کے لئے پریشان ہو گیا، لیکن فوراً سنبھل کر اس نے ڈاکٹر سے کہا۔

کوئی بات نہیں ـــ میں اندر اپنے بستر پر لیٹتا ہوں۔ تم بھاگ کر زہر لے کر آؤ۔"

بستر پر لیٹ کر سرخ کھردرے کمبل میں اس نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور اپنی مندی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔ کہرے کی چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہوئی تھیں، جن کے صحیح خدوخال نظر نہیں آتے تھے ـــ ایک لمبا، بہت لمبا، بہت ہی لمبا، نہ ختم ہونے والا دالان تھا ـــ یا شاید کمرہ، جس میں دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ جگہ میلی ہو رہی تھی۔

دور بہت دور ایک فرشتہ کھڑا تھا۔ جب وہ آگے بڑھنے لگا تو چھوٹا ہوتا گیا۔ عطا اللہ کی چارپائی کے پاس پہنچ کر وہ ڈاکٹر بن گیا۔ وہی ڈاکٹر جو اس کی بیوی سے ہر وقت ہمدردی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اور اسے بڑے پیار سے دلاسا دیتا تھا۔

عطا اللہ نے اسے پہچانا تو اٹھنے کی کوشش کی۔ "آیئے ڈاکٹر صاحب۔"

مگر وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ عطا اللہ لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ کہرا دور ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس کا دماغ بھی صاف تھا۔ ایک دم وارڈ میں شور بلند ہوا۔ سب سے اونچی آواز جو چیخ سے مشابہ تھی۔ زینب کی تھی۔ اس کی بیوی کی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی ـــ معلوم نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ عطا اللہ نے اٹھنے کی کوشش کی۔ زینت کو آواز دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا ـــ دھند پھر پھیلنے لگی اور وارڈ لمبا ـــ بہت لمبا ہوتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد زینب آئی۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے عطا اللہ کو جھنجوڑنا شروع کیا۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے ـــ میں نے اس حرامزادے کو مار ڈالا ہے۔"

"کس کو؟"

"اسی کو جو مجھ سے اتنی ہمدردی جتایا کرتا تھا..... اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں بچا لے گا..... وہ جھوٹا تھا..... دغا باز تھا۔ اس کا دل توے کی کالک سے بھی زیادہ کالا تھا۔۔۔ اس نے مجھے۔۔۔ اس نے مجھے۔۔۔" اس کے آگے زینب کچھ نہ کہہ سکی۔

عطا اللہ کے دماغ میں بے شمار خیالات آئے اور آپس میں گڈ مڈ ہو گئے۔ "تمہیں تو اس نے مار ڈالا تھا؟"

زینب چیخی۔ "نہیں۔۔۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔"

عطا اللہ چند لمحے خلا میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زینب کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹایا۔ "تم اِدھر ہو جاؤ۔۔۔ وہ آ رہا ہے۔"

"کون؟"

"وہی ڈاکٹر۔۔۔ وہی فرشتہ۔"

فرشتہ آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں زہر بھری سرنج تھی۔

عطا اللہ مسکرایا۔ "لے آئے؟"

فرشتے نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں لے آیا۔"

عطا اللہ نے اپنا لرزاں بازو اس کی طرف بڑھایا۔ "تو لگا دو۔"

فرشتے نے سوئی اس کے بازو میں گھونپ دی۔

عطا اللہ مر گیا۔

زینب اُسے جھنجوڑنے لگی۔ "اُٹھو۔ اُٹھو، کریم رحیم کے ابا، اُٹھو۔۔۔ یہ ہسپتال بہت بُری جگہ ہے۔۔۔ چلو گھر چلیں۔"

تھوڑی دیر کے بعد پولیس آئی اور زینب کو اس کے خاوند کی لاش پر سے ہٹا کر اپنے ساتھ لے گئی۔

('پھندنے' سے)

پُھندنے

کوٹھی سے ملحقہ وسیع وعریض باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے ایک بلّی نے بچے دیئے تھے جو بلا کھا گیا تھا۔ پھر ایک کتیا نے بچے دیئے جو بڑے بڑے ہو گئے تھے اور دن رات کوٹھی کے اندر باہر بھونکتے اور گندگی بکھیرتے رہتے تھے۔ ان کو زہر دے دیا گیا تھا ـــــ ایک ایک کر کے سب مر گئے تھے۔ ان کی ماں بھی ـــــ ان کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی یقینی تھی۔

جانے کتنے برس گزر چکے تھے ـــــ کوٹھی سے ملحقہ باغ کی جھاڑیاں سینکڑوں ہزاروں مرتبہ کتری بیونتی، کاٹی چھانٹی جا چکی تھیں۔ کئی بلّیوں اور کتیوں نے ان کے پیچھے بچے دیئے تھے جن کا نام ونشان بھی نہ رہا تھا ـــــ اس کی اکثر بدعادت مرغیاں وہاں انڈے دے دیا کرتی تھیں۔ جن کو ہر صبح اُٹھا کر وہ اندر لے جاتی تھی۔

اسی باغ میں کسی آدمی نے ان کی نوجوان ملازمہ کو بڑی بیدردی سے قتل کر دیا تھا ـــــ اس کے گلے میں اس کا پھندنوں والا سرخ ریشمی ازاربند جو اس نے دو روز پہلے پھیری والے سے آٹھ آنے میں خریدا تھا پھنسا ہوا تھا۔ اس زور سے قاتل نے پیچ دیئے تھے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

اس کو دیکھ کر اتنا تیز بخار چڑھا تھا کہ بے ہوش ہو گئی تھی ـــــ اور شاید ابھی تک بیہوش

تھی۔ لیکن نہیں ایسا کیوں کر ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس قتل کے دیر بعد مرغیوں نے انڈے نہیں بلیوں نے بچے دیئے تھے اور ایک شادی ہوئی تھی ―― کتیا تھی جس کے گلے میں لال دوپٹہ تھا مقیشی ―― جھلل جھلل کرتا۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی نہیں تھیں۔ اندر دھنسی ہوئی تھیں۔

باغ میں بینڈ بجا تھا ―― سرخ وردیوں والے سپاہی آئے تھے جو رنگ برنگی شکلیں بغلوں میں دبا کر منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے تھے۔ ان کی وردیوں کے ساتھ کئی پھندنے لگے تھے۔ جنہیں اٹھا اٹھا کر لوگ اپنے ازار بندوں میں لگاتے جاتے تھے ―― پر جب صبح ہوئی تھی تو ان کا نام و نشان تک نہیں تھا ―― سب کو زہر دے دیا گیا تھا۔

دلہن کو جانے کیا سوجھی کم بخت نے جھاڑیوں کے پیچھے نہیں، اپنے بستر پر صرف ایک بچہ دیا ―― جو بڑا اگل گوتھنا، لال پھندنا تھا۔ اس کی ماں مر گئی ―― باپ بھی ―― دونوں کو بچے نے مارا ―― اس کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتی۔

سرخ وردیوں والے سپاہی بڑے بڑے پھندنے لٹکائے جانے کہاں غائب ہوئے کہ پھر نہ آئے۔ باغ میں بلے گھومتے تھے، جو اسے گھورتے تھے۔ اس کو چھچھوندروں کی بھری ہوئی ٹوکری سمجھتے تھے حالانکہ ٹوکری میں نارنگیاں تھیں۔

ایک دن اس نے اپنی دو نارنگیاں نکال کے آئینے کے سامنے رکھ دیں۔ اس کے پیچھے ہو کے اس نے ان کو دیکھا مگر نظر نہ آئیں۔ اس نے سوچا اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی ہیں ―― مگر وہ اس کے سوچتے سوچتے ہی بڑی ہو گئیں اور اس نے ریشمیں کپڑے میں لپیٹ کر آتش دان پر رکھ دیں۔

اب کتے بھونکنے لگے ―― نارنگیاں فرش پر لڑھکنے لگیں ―― کوٹھی کے ہر فرش پر اچھلیں، ہر کمرے میں کودیں اور اچھلتی کودتی بڑے بڑے باغوں میں بھاگنے دوڑنے لگیں ―― کتے ان سے کھیلتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔

جانے کیا ہوا، ان کتوں میں دو زہر کھا کے مر گئے۔ جو باقی بچے وہ ان کی ادھیڑ عمر کی

ہٹی کٹی ملازمہ کھا گئی۔ یہ اس نوجوان کی جگہ آئی تھی۔ جس کو کسی آدمی نے قتل کر دیا تھا گلے میں اس کے پھندنوں والے ازار بند کا پھندا ڈال کر۔

اس کی ماں تھی۔ ادھیڑ عمر کی ملازمہ سے عمر میں چھ سات برس بڑی۔ اس کی طرح ہٹی کٹی نہیں تھی۔ ہر روز صبح شام موٹر میں سیر کو جاتی تھی اور بدعادت مرغیوں کی طرح دور دراز باغوں میں جھاڑیوں کے پیچھے انڈے دیتی تھی۔ ان کو وہ خود اٹھا کے لاتی تھی نہ ڈرائیور۔

اولمیٹ بناتی تھی جس کے داغ کپڑوں پر پڑ جاتے تھے۔ سوکھ جاتے تو ان کو باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے پھینک دیتی تھی۔ جہاں سے چیلیں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔

ایک دن اس کی سہیلی آئی —— پاکستان میل، موٹر نمبر ۹۶۱۲ پی۔ ایل بڑی گرمی تھی۔ ڈیڈی پہاڑ پر تھے۔ ممی سیر کرنے گئی ہوئی تھیں —— پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی بلاؤز اتاری اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ اس کے دودھ ابلے ہوئے تھے۔ جو آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہو گئے۔ اس کے دودھ ٹھنڈے تھے جو آہستہ آہستہ ابلنے لگے۔ آخر دونوں دودھ ہل ہل کے کنگنے ہو گئے اور کھٹی لسی بن گئے۔

اس سہیلی کا بینڈ بج گیا —— مگر وہ وردی والے سپاہی پھندنے نچاتے نہ آئے۔ ان کی جگہ پیتل کے برتن تھے —— چھوٹے اور بڑے جن سے آوازیں نکلتی تھیں۔ گرجدار اور دھیمی —— دھیمی اور گرجدار۔

یہ سہیلی جب پھر ملی تو اس نے بتایا کہ وہ بدل گئی ہے۔ سچ مچ بدل گئی۔ اس کے اب دو پیٹ تھے۔ ایک پرانا، دوسرا نیا، ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا تھا۔ اس کے دودھ پھٹے ہوئے تھے۔

پھر اس کے بھائی کا بینڈ بجا —— ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ بہت روئی۔ اس کے بھائی نے اس کو بہت دلاسا دیا۔ بیچاری کو اپنی شادی یاد آگئی تھی۔

رات بھر اس کے بھائی اور اس کی دلہن کی لڑائی ہوتی رہی، وہ روتی رہی، وہ ہنستا رہا —— صبح ہوئی تو ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ اس کے بھائی کو دلاسہ دینے کے لئے اپنے ساتھ

لے گئی۔ دُلہن کو نہلایا گیا ــــ اس کی شلوار میں اس کا لال پھندنوں والا ازار بند پڑا تھا ــــ معلوم نہیں یہ دُلہن کے گلے میں کیوں نہ باندھا گیا۔ اس کی آنکھیں بہت موٹی تھیں۔ اگر گلا زور سے گھونٹا جاتا تو وہ ذبح کئے ہوئے بکرے کی آنکھوں کی طرح باہر نکل آتیں ــــ اور اس کو بہت تیز بخار چڑھتا مگر پہلا تو ابھی تک اُترا نہیں۔ ہو سکتا ہے اُتر گیا ہو اور یہ نیا بخار ہو جس میں وہ ابھی تک بیہوش ہے۔

اس کی ماں موٹر ڈرائیوری سیکھ رہی ہے ــــ باپ ہوٹل میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی آتا ہے اور اپنے لڑکے سے مل کر چلا جاتا ہے۔ لڑکا کبھی کبھی اپنی بیوی کو گھر بلا لیتا ہے۔ ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کو دو تین روز کے بعد کوئی یاد ستاتی ہے تو رونا شروع کر دیتی ہے۔ وہ اُسے دلاسا دیتا ہے، وہ اسے پچکارتی ہے اور دُلہن چلی جاتی ہے۔

اب وہ اور دُلہن بھائی دونوں سیر کو جاتی ہیں ــــ سہیلی بھی پاکستان میل۔ موٹر نمبر ۹۶۱۲ پی ایل سیر کرتے کرتے اجنتا جا نکلتی ہیں جہاں تصویریں بنانے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ تصویریں دیکھ کر تینوں تصویر بن جاتی ہیں۔ رنگ ہی رنگ، لال، پیلے، ہرے، نیلے ــــ سب کے سب چیخنے والے ہیں۔ ان کو ان رنگوں کا خالق چُپ کراتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال ہیں۔ سردیوں اور گرمیوں میں اوورکوٹ پہنتا ہے۔ اچھی شکل و صُورت کا ہے۔ اندر باہر ہمیشہ کھڑاؤں استعمال کرتا ہے ــــ اپنے رنگوں کو چُپ کرانے کے بعد خود چیخنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو یہ تینوں چُپ کراتی ہیں اور بعد میں خود چلّانے لگتی ہیں۔ تینوں اجنتا میں مجرد آرٹ کے سیکڑوں نمونے بناتی رہیں۔ ایک کی ہر تصویر میں عورت کے دو پیٹ ہوتے ہیں، مختلف رنگوں کے ــــ دُوسری کی تصویروں میں عورت ادھیڑ عُمر کی ہوتی ہے۔ ہٹی کٹی۔ تیسری کی تصویروں میں پھندنے ہی پھندنے ازاربندوں کا گچھا۔

مُجرّد تصویریں بنتی رہیں۔ مگر تینوں کے دُودھ سوکھتے رہے ــــ بڑی گرمی تھی، اتنی کہ تینوں پسینے میں شرابور تھیں۔ خس لگے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی اُنھوں نے اپنے بلاؤز

اتارے اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ پنکھا چلتا رہا۔ دودھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوئی نہ گرمی۔
اس کی ممی دُوسرے کمرے میں تھی۔ ڈرائیور اس کے بدن سے موبل آئل پونچھ رہا تھا۔
ڈیڈی ہوٹل میں تھا۔ جہاں اس کی لیڈی سٹینو گرافر اس کے ماتھے پر یوڈی کلون مل
رہی تھی۔

ایک دن اس کا بھی بینڈ بج گیا۔ اُجاڑ باغ پھر بارونق ہو گیا۔ گملوں اور دروازوں کی
آرائش اجنتا اسٹڈیو کے مالک نے کی تھی۔ بڑی بڑی گہری لپ اسٹکیں، اس کے بکھیرے ہوئے
رنگ دیکھ کر اُڑ گئیں، ایک جو زیادہ سیاہی مائل تھی، اتنی اڑی کہ وہیں گر کر اس کی شاگرد ہو گئی
اس کے عروسی لباس کا ڈیزائن بھی اُس نے تیار کیا تھا۔ اس نے اس کی ہزاروں سمتیں
پیدا کر دی تھیں۔ عین سامنے سے دیکھو تو وہ مختلف رنگ کے ازار بندوں کا بنڈل معلوم ہوتی
تھی۔ ذرا اِدھر ہٹ جاؤ تو پھلوں کی ٹوکری تھی۔ ایک طرف ہو جاؤ تو کھڑکی پر پڑا ہوا پھلکاری
کا پردہ۔ عقب میں چلے جاؤ تو کچلے ہوئے تربوزوں کا ڈھیر —— ذرا زاویہ بدل کر دیکھو تو ٹماٹو ساس
سے بھرا ہوا مرتبان۔ اُوپر سے دیکھو تو یگانہ آرٹ۔ نیچے سے دیکھو تو میراجی کی مبہم شاعری۔
فن شناس نگاہیں عش عش کر اُٹھیں —— دُلہا اس قدر متاثر ہوا تھا کہ شادی کے دُوسرے
روز ہی اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بھی مجرّد آرٹسٹ بن جائے گا۔ چنانچہ اپنی بیوی کے ساتھ وہ اجنتا
گیا۔ جہاں اُنھیں معلوم ہوا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور وہ چند روز سے اپنی ہونے والی دلہن
ہی کے ہاں رہتا ہے۔

اس کی ہونے والی دُلہن وہی گہرے رنگ کی لپ اسٹک تھی جو دُوسری لپ اسٹکوں
کے مقابلے میں زیادہ سیاہی مائل تھی۔ شرُوع شرُوع میں چند مہینے تک اس کے شوہر کو اس
سے اور مجرّد آرٹ سے دلچسپی رہی۔ لیکن جب اجنتا اسٹڈیو بند ہو گیا۔ اور اس مالک کی کہیں
سے بھی سن گن نہ ملی تو اس نے نمک کا کاروبار شروع کر دیا۔ جو بہت نفع بخش تھا۔
اس کاروبار کے دوران میں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی۔ جس کے دُودھ سُوکھے

ہُوئے نہیں تھے۔ یہ اس کو پسند آ گئے۔ بینڈ نہ بجا۔ لیکن شادی ہو گئی۔ پہلی اپنے برش اُٹھا کر لے گئی اور الگ رہنے لگی۔

یہ ناچاقی پہلے تو دونوں کے لئے تلخی کا موجب ہُوئی۔ لیکن بعد میں ایک عجیب و غریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی سہیلی نے جو دُوسرا شوہر تبدیل کرنے کے بعد سارے یورپ کا چکر لگا آئی تھی اور اب دِق کی مریض تھی اس مٹھاس کو کیوبک آرٹ میں پینٹ کیا۔ صاف شفّاف چینی کے بے شمار کیوب تھے جو تھوہر کے پودوں کے درمیان اس انداز سے اُوپر تلے رکھے تھے کہ ان سے دو شکلیں بن گئی تھیں۔ ان پر شہد کی مکھیاں بیٹھی رس چوس رہی تھیں۔

اس کی دُوسری سہیلی نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ جب اس کو یہ المناک خبر ملی تو وہ بیہوش ہو گئی۔ معلوم نہیں بیہوشی نئی تھی یا وہی پُرانی جو بڑے تیز بخار کے بعد ظہُور میں آئی تھی۔

اس کا باپ یوڈی کلون میں تھا۔ جہاں اس کا ہوٹل اس کی لیڈی سٹینو گرافر کا سر سہلاتا تھا۔

اس کی ممی نے گھر کا سارا حساب کتاب ادھیڑ عُمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کے حوالے کر دیا تھا۔ اب اس کو ڈرائیونگ آ گئی تھی مگر بیمار ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی اس کو ڈرائیور کے بن ماں کے بچے کا بہت خیال تھا۔ وہ اس کو اپنا موبل آئل پلاتی تھی۔

اس کی بھابی اور اس کے بھائی کی زندگی بہت ادھیڑ اور ہٹی کٹی ہو گئی تھی۔ دونوں آپس میں بڑے پیار سے ملتے تھے کہ اچانک ایک رات جب کہ ملازمہ اور اس کا بھائی گھر کا حساب کر رہے تھے۔ اس کی بھابی نمودار ہُوئی وہ مجرد تھی ـــــ اس کے ہاتھ میں قلم تھا نہ برش۔ لیکن اس نے دونوں کا حساب صاف کر دیا۔

صُبح کمرے میں سے جمے ہُوئے لہو کے دو بڑے بڑے پھندنے نکلے جو اس کی بھابی کے گلے میں لگا دیئے گئے۔

اب وہ قدرے ہوش میں آئی۔ خاوند سے ناچاقی کے باعث اس کی زندگی تلخ ہو کر بعد میں عجیب و غریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے اس کو تھوڑا سا تلخ بنانے کی کوشش

کی اور شراب پینا شروع کی مگر ناکام رہی، اس لیے کہ مقدار کم تھی —— اس نے مقدار بڑھا دی حتیٰ کہ وہ اس میں ڈبکیاں لینے لگی —— لوگ سمجھتے تھے کہ اب غرق ہوئی اور اب غرق ہوئی مگر وہ سطح پر اُبھر آتی تھی۔ مُنہ سے شراب پونچھتی ہوئی اور قہقہے لگاتی ہوئی۔

صبح کو جب اُٹھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ رات بھر اس کے جسم کا ذرہ ذرہ دھاڑیں مار مار کر روتا رہا ہے —— اس کے وہ سب بچے جو پیدا ہو سکتے تھے، ان قبروں میں جوان کے لیے بن سکتی تھیں، اس دُودھ کے لیے جو ان کا ہو سکتا تھا۔ بلک بلک کر رو رہے ہیں —— مگر اس کے دُودھ کہاں تھے —— وہ تو جنگلی بلّے پی چکے تھے۔

وہ اور زیادہ پیتی کہ اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے مگر اس کی خواہش پوری نہیں ہوتی تھی۔ ذہین تھی پڑھی لکھی تھی۔ جنسی موضوعات پر بغیر کسی تصنّع کے بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ مردوں کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی کسی بدعادت مُرغی کی طرح جھاڑیوں کے پیچھے جائے اور ایک انڈا دے آئے۔

بالکل کھوکھلی ہو گئی۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تو اس سے لوگ دُور رہنے لگے —— وہ سمجھ گئی، چنانچہ وہ ان کے پیچھے نہ بھاگی اور اکیلی گھر میں رہنے لگی۔ سگرٹ پر سگرٹ پھونکتی، شراب پیتی اور جانے کیا سوچتی رہتی —— رات کو بہت کم سوتی تھی۔ کوٹھی کے اردگرد گھومتی رہتی تھی۔

سامنے کوارٹر میں ڈرائیور کا بن ماں کا بچہ موبل آئل کے لیے روتا رہتا تھا۔ مگر اس کی ماں کے پاس ختم ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے ایکسی ڈنٹ کر دیا تھا۔ موٹر گیراج میں اور اس کی ماں ہسپتال میں پڑی تھی۔ جہاں اس کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی تھی۔ دُوسری کاٹی جانے والی تھی۔

وہ کبھی کبھی کوارٹر کے اندر جھانک کر دیکھتی تو اس کو محسوس ہوتا کہ اس کے دودھوں کی تلچھٹ میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی ہے۔ مگر اس بدذائقہ شے سے تو اس کے بچّے کے

ہونٹ بھی تر نہ ہوتے۔

اس کے بھائی نے کچھ عرصے سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس کا خط سوئٹزرلینڈ سے آیا کہ وہ وہاں اپنا علاج کرا رہا ہے۔ نرس بہت اچھی ہے۔ ہسپتال سے نکلتے ہی وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔

ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ نے تھوڑا زیور، کچھ نقدی اور بہت سے کپڑے جو اس کی ممی کے تھے چرائے اور چند روز کے بعد غائب ہو گئی۔ اس کے بعد اس کی ماں آپریشن ناکام ہونے کے باعث ہسپتال میں مر گئی۔

اس کا باپ جنازے میں شامل ہُوا۔ اس کے بعد اس نے اس کی صورت نہ دیکھی۔

اب وہ بالکل تنہا تھی۔ جتنے نوکر تھے، اس نے علیحدہ کر دیئے، ڈرائیور سمیت۔ اس کے بچے کے لیے اس نے ایک آیا رکھ دی ——— کوئی بوجھ سوائے اس کے خیالوں کے باقی نہ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ آہستہ آہستہ اسے ان سے بھی چھٹکارا مل جائے۔ کبھی کبھار اگر کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ اندر سے چلا اُٹھتی تھی "چلے جاؤ ——— جو کوئی بھی تم ہو چلے جاؤ ——— میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔"

سیف میں اس کو اپنی ماں کے بے شمار قیمتی زیورات ملے تھے۔ اس کے اپنے بھی تھے۔ جن سے ان کو کوئی رغبت نہ تھی، مگر اب وہ رات کو گھنٹوں آئینے کے سامنے ننگی بیٹھ کر یہ تمام زیور اپنے بدن پر سجاتی اور شراب پی کر بے سُری آواز میں فحش گانے گاتی تھی۔ آس پاس اور کوئی کوٹھی نہیں تھی۔ اس لیے اسے مکمل آزادی تھی۔

اپنے جسم کو تو وہ کئی طریقوں سے ننگا کر چکی تھی۔ اب وہ چاہتی کہ اپنی رُوح کو بھی ننگا کر دے۔ مگر اس میں وہ زبردست حجاب محسوس کرتی تھی۔ اس حجاب کو دبانے کے لیے صرف ایک ہی طریقہ اس کی سمجھ میں آتا تھا کہ پیئے اور خوب پیئے اور اس حالت میں اپنے ننگے بدن سے مدد لے ——— مگر یہ ایک بہت بڑا المیہ تھا کہ وہ آخری حد تک ننگا ہو کر ستر پوش ہو گیا تھا۔

تصویریں بنا بنا کر وہ تھک چکی تھی ـــــ ایک عرصے سے اس کا پینٹنگ کا سامان صندوقچے میں بند پڑا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے سب رنگ نکالے اور بڑے بڑے پیالوں میں گھولے۔ تمام برش دھو دھا کر ایک طرف رکھے اور آئینے کے سامنے ننگی کھڑی ہو گئی اور اپنے جسم پر نئے خدوخال بنانے شروع کئے۔ اس کی یہ کوشش اپنے وجود کو مکمل طور پر عُریاں کرنے کی تھی۔

وہ اپنا سامنا حصہ ہی پینٹ کر سکتی تھی۔ دن بھر وہ اسی میں مصروف رہی۔ بن کھائے پیئے، آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بدن پر مختلف رنگ جماتی اور ٹیڑھے بنگے خطوط بناتی رہی۔ اس کے برش میں اعتماد تھا ـــــ آدھی رات کے قریب اس نے دُور ہٹ کر اپنا بغور جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے تمام زیورات ایک ایک کر کے اپنے رنگوں سے لتھڑے ہوئے جسم پر سجائے اور آئینے میں ایک بار پھر غور سے دیکھا کہ ایک دم آہٹ ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا ـــــ ایک آدمی چھُرا ہاتھ میں لئے، منہ پر ٹھاٹھا باندھے کھڑا تھا جیسے حملہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب وہ مڑی تو حملہ آور کے حلق سے چیخ بلند ہوئی۔ چھُرا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ افراتفری کے عالم میں کبھی اِدھر کا رُخ کیا کبھی اُدھر کا ـــــ آخر جو رستہ ملا اس میں سے بھاگ نکلا۔

وہ اس کے پیچھے بھاگی، چیختی پکارتی "ٹھہرو ـــ ٹھہرو ـــ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی ـــ ٹھہرو"

مگر چور نے اس کی ایک نہ سُنی اور دیوار پھاند کر غائب ہو گیا۔ مایوس ہو کر واپس آ گئی۔ دروازے کی دہلیز کے پاس چور کا خنجر پڑا تھا۔ اس نے اُسے اُٹھا لیا اور اندر چلی گئی ـــ اچانک اس کی نظریں آئینے سے دو چار ہوئیں۔ جہاں اس کا دل تھا۔ وہاں اس نے میان نما چمڑے کے رنگ کا خول سا بنایا ہوا تھا۔ اس نے خنجر رکھ کر دیکھا۔ خول بہت چھوٹا تھا۔ اس نے خنجر پھینک دیا۔ اور بوتل میں سے شراب کے چار پانچ بڑے گھونٹ پی کر اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی ـــ وہ کئی بوتلیں خالی کر چکی تھی۔ کھایا کچھ بھی نہیں تھا۔

دیر تک ٹہلنے کے بعد وہ پھر آئینے کے سامنے آئی۔ اس کے گلے میں ازار بند نما گلوبند تھا۔ جس کے بڑے بڑے پھندنے تھے۔ یہ اس نے رِبش سے بنایا تھا۔
دفعتاً اس کو ایسا محسوس ہُوا کہ یہ گلوبند تنگ ہونے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے گلے کے اندر دھنستا جا رہا ہے ـــــ وہ خاموش کھڑی آئینے میں آنکھیں گاڑے رہی جو اسی رفتار سے باہر نکل رہی تھیں ـــــ تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے کی تمام رگیں پھُولنے لگیں۔ پھر ایک دم سے اس نے چیخ ماری اور اوندھے مُنہ فرش پر گر پڑی۔

('پھندنے' سے)

سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری

از

ڈاکٹر احمد بختیار اشرف

سعادت حسن منٹو اُردو افسانے کی تاریخ کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز، سب سے زیادہ اہم اور سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ وہ ہماری معاشرتی اور عمرانی صورتِ حال کا بے باک نقاد اور نکتہ چیں ہے جس کا قلم ایک ماہر اور باضمیر ڈاکٹر کے نشتر کی طرح سماج کی گلی سڑی لاش پر اسی طرح چلتا اور اس پہ کیے گئے مظالم اور زیادتیوں کا کھوج لگاتا ہے کہ اس لاش پر ظلم ڈھانے والے طبقوں اور افراد کے گناہ اور جرائم بے نقاب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس ادبی ڈاکٹر کی غیر جانبدارانہ رپورٹ حقائق کا ایکسرے پیش کر دیتی ہے۔ اس کی باریک بین نگاہ کے سامنے کوئی عیب اور عارضہ چھپ نہیں سکتا۔ وہ ایک بے باک حقیقت نگار ہے جس کا قلم بغیر کسی رُو رعایت کے معاشرے کے تضادات کو پیش کرتا ہے۔

۲

منٹو کو افسانے کی ایک مستحکم روایت ملی جس میں ایک طرف حقیقت نگاری کا انداز موجود تھا۔ اور دُوسری طرف رومانوی رویے پائے جاتے تھے۔ حقیقت نگاری سے اُردو والوں کو پریم چند نے متعارف کرایا اور آگے چل کر ترقی پسند تحریک نے اس کو اپنایا بلکہ یہ کہنا زیادہ

مناسب ہوگا کہ پریم چند کے اثرات اُردو افسانے پر بڑے دیرپا ثابت ہوئے۔ دوسری طرف سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور حجاب امتیاز علی نے رومان سے افسانے کو سجایا۔ اُنھوں نے زندگی کے رومانوی اور جمالیاتی پہلوؤں کو اپنایا لیکن اس تحریک کے اثرات زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔ اس لئے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سعادت حسن منٹو پریم چند کی روایت سے بندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن یہاں ایک فرق کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے کہ پریم چند کے یہاں حقیقت پسندی، مثالیت پسندی کے ساتھ ملی جُلی ہے۔ وہ زندگی کا جو مثالی تصور رکھتے تھے اس کو اُنھوں نے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ان کی حقیقت نگاری مثالیت پسندی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کے تضادات کو پیش کرتے ہوئے ان کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھارنے میں ناکام رہتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے انھیں جاگیرداری نظام سے کے ساتھ ہمدردی ہے، ہوسکتا ہے یہ ان کی انسان دوستی کے طفیل بھی ہو کہ وہ بُرے انسانوں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچاتے بلکہ ان کی اصلاح کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ترقی پسندوں کے یہاں جو حقیقت نگاری ہے اس پر جذباتیت کا رنگ غالب رہا۔ پیداواری رشتوں کی بات بالکل جائز اور درست سہی لیکن زندگی کو ایک ہی زاویہ نگاہ سے دیکھنا صحت مندی کی علامت نہیں ہے۔ ترقی پسندوں کے فن کو انتہاپسندانہ رویّے، موضُوع کی یکسانیت اور کھلی ڈُلی معروضیت نے نقصان پہنچایا۔ منٹو اس لحاظ سے ایک منفرد افسانہ نگار ہے کہ جس کے یہاں حقیقت نگاری کا ایک ایسا بے لاگ رویہ اور اسلوب ملتا ہے کہ جس کی مثال اُردو میں کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتی۔ مثالیت پسندی اور رومانیت ان کا راستہ نہیں روکتی، نہ جذباتیت اِن پر غالب آتی ہے۔ وہ ایک بے باک بے خوف اور نڈر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے یہاں دُوسرے ترقی پسندوں کی طرح نہ تو انتہاپسندی ہے اور نہ محض پیداواری رشتوں کی تکرار ـــــ منٹو کے قلم کی زد سے عالم و عامی، مذہبی پیشوا، حاکم، رعایا، بوڑھا، جوان، غریب، امیر کوئی بھی نہیں بچ سکا۔ وہ زندگی کے ہر پہلو پر لکھتا ہے اور اتنی بے باکی سے لکھتا ہے کہ کبھی کبھی ہمارے

اندر ناگواری کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ لیکن ناگواری کا یہ احساس صرف اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ اس میں ہماری اپنی کمزوریوں اور تضادات کی نشاندہی ہوتی ہے منٹو کا فن سچائیوں کے انکشافات اور گناہوں کے اعتراف کا فن ہے۔ یہ فن متاثر بھی کرتا ہے اور جھنجھوڑتا بھی ہے۔ یہ فن ہماری کوتاہیوں اور خامیوں کا عکس بھی پیش کرتا ہے اور ہمیں ہماری حیوانیت کا احساس دلا کر بھی ہمیں آدمیت کے مدارج سے خارج نہیں کرتا۔

۳

سعادت حسن منٹو کے ہم عصروں میں کرشن چندر اور بیدی شامل ہیں۔ عام طور پہ اردو افسانے کی تاریخ میں یہی نام "تین بڑوں" میں شمار ہوتے ہیں۔ کرشن چندر کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے، رومان اور حقیقت سے اس کی آنکھ مچولی رہی۔ "طلسم خیال" اور "زندگی کے موڑ پر" کے بیشتر افسانوں میں رومانی رویہ بہت نمایاں ہے بلکہ یہ کہنا بھی بیجا نہ ہوگا کہ کرشن کے یہاں افسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد رومانوی افسانوں کے ذیل میں شمار کی جا سکتی ہے لیکن دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح وہ بتدریج زندگی کے تلخ حقائق اور مسائل کی طرف آتا گیا۔ البتہ اس نے بھی منٹو کی طرح کثرت سے لکھا اور دونوں میں ایک قدر مشترک موجود ہے کہ دونوں کے یہاں بُرے افسانوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ سبب اس کا وہی بسیار نویسی ہے۔ تاہم کرشن کے یہاں بیسیوں عمدہ اور معیاری افسانے موجود ہیں جو اُن کو اُردو افسانہ نگاری میں ایک مستقل مقام دلانے کے لیے کافی ہیں۔ بیدی نے مقدار کو نہیں معیار کو سامنے رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان دونوں بڑے افسانہ نگاروں کی نسبت اس نے کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا اس میں ایک معیار قائم رکھا۔ بیدی کے یہاں افسانوں میں مسلسل ارتقاء کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ اس کے یہاں معنوی تہیں ملتی ہیں۔ قدیم اساطیری حوالوں کو اس نے اپنے افسانوں میں برتا جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں دو معنوی سطحیں پیدا ہو گئیں اور یوں ماضی اور حال ایک دوسرے میں پیوست ہوتے گئے۔ ماضی

ایک نئی معنویت لے کر اُبھرا اور حال نے ماضی کے ساتھ زمانی تسلسل قائم رکھا۔منٹو ان دونوں سے اس طرح مختلف ہے کہ اس کے یہاں نہ تو مثالیت اور رومان کے عناصر ہیں نہ وہ اساطیر اور مابعد الطبیعات کا سہارا لیتا ہے بلکہ وہ معروضی حقیقتوں سے اپنے موضوعات چن کر ان کو نہایت معروضی انداز میں پیش کرتا ہے۔منٹو کے یہاں صداقتوں کے اظہار کا رویّہ کارفرما ہے۔ وہ صداقتوں کا متلاشی ہے۔ خباثتوں سے پاک معاشرے کا طالب ہے اسے منافقت سے سخت چڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منافقتوں اور خباثتوں سے بھرے معاشرے کے خلاف اس کی تنقید میں ہمدردی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ شروع دور کی کہانیوں میں اس بے رحم حقیقت نگاری کو ممتاز شیریں نے منٹو کے قلم کی "منفی" اور "تخریبی" قوت قرار دیا تھا۔لیکن میرے خیال میں یہ تخریب دراصل اس کے تعمیری اور مثبت فلسفے کی ابتدا کے لئے ضروری تھی جو بعد میں منٹو کی کہانیوں میں دکھائی دیتا ہے۔منٹو معاشرے کی بُرائیوں کو لگی لپٹی رکھے بغیر اس طرح نمایاں کر دیتا ہے کہ اس کے تمام عیوب بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ وہ استحصال اور جارحیت کے خلاف مصلحتوں کا جھنڈا نہیں اٹھاتا بلکہ کھُلی بغاوت کا اعلان کرتا ہے اور اپنی کہانیوں میں اقتصادی، سماجی، سیاسی اور مذہبی ناہمواریوں، منافقتوں، استحصالی ہتھکنڈوں، ناجائز ذرائع سے حصول منفعت کے تمام حربوں کے خلاف اپنا طنز اور نشتر اس طرح سے چلاتا ہے کہ ٹیسوں کی آواز ہمارے کانوں تک پہنچنے لگتی ہے اور کانوں سے اُتر کر ہمارے ضمیر میں داخل ہو جاتی ہے۔

وہ کسی کی ناراضی سے، غم و غصہ سے، یا انتقام سے بے نیاز ہے۔ دُوسری طرف اسے صلے کی پرواہ نہیں اور نہ کبھی کسی سے مرعوب ہُوا ہے۔ وہ مرعوب کرنے والا ہے۔ کسی کے مرتبے، مقام، عہدے سے مرعوب ہونے والا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا قلم خوف تحریص اور مصلحت اندیشی سے بے پرواہ، بے باکی، بے خوفی اور بغیر کسی امتیاز کے تنقید اور تجزیہ کرتا ہے۔ واقعات کو پیش کرتے وقت جان بُوجھ کر مبالغہ بھی کرتا ہے بلکہ مبالغہ اس کا ایک بڑا حربہ ہے۔ وہ یہ حربہ ہمیں خوف زدہ کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے تاکہ ہم بُری حرکتوں سے باز آجائیں۔ اس کا مبالغہ نیک نیتی پر مبنی ہوتا ہے۔

یہ مبالغہ کہانی میں سسپنس اور دہشت کی فضا پیدا کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ ہم اپنی حرکتوں کو معمولی یا کم حیثیت تصور نہ کر بیٹھیں۔ ہماری چھوٹی چھوٹی خباثتیں معاشرے کے لئے ناسور بن جاتی ہیں۔ اس لئے منٹو ان کو بڑھا چڑھا کے پیش کرتا ہے کہ ہم ان سے عبرت حاصل کریں اور اپنی بظاہر کم حیثیت بُرائیوں سے باز آ جائیں۔

۴

منٹو کے افسانوی مجموعوں کی تعداد کم و بیش سترہ اٹھارہ ہے۔ ان مجموعوں میں شامل افسانوں کی مجموعی تعداد سوا دو سو کے قریب ہے۔ ان افسانوی مجموعوں میں آتش پارے، منٹو کے افسانے، لذتِ سنگ، ٹھنڈا گوشت، یزید، خالی بوتلیں خالی ڈبے، نمرود کی خدائی، سڑک کے کنارے، سرکنڈوں کے پیچھے اور شکاری عورتیں قابل ذکر ہیں۔

ان میں سے چار مجموعے قیام پاکستان سے پہلے شائع ہوئے اور چودہ مجموعے قیام پاکستان کے بعد چھپے۔ منٹو کا پہلا افسانوی مجموعہ آتش پارے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا اور ان کی وفات ۱۹۵۵ء تک سولہ سترہ مجموعے منظر عام پر آئے اس طرح گویا منٹو نے بیس سال میں سوا دو سو افسانے اُردو ادب کو دیئے جو تعداد کے لحاظ سے کم نہیں ہیں۔ ان کہانیوں میں دو چار نہیں۔ دس پانچ نہیں بیسیوں ایسی کہانیاں موجود ہیں جو عالمی ادب کے معیار اور سطح کی کہانیاں قرار دی جا سکتی ہیں، زیرِ نظر مجموعے میں آپ کو ایسی ہی کہانیاں ملیں گی۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ منٹو کے افسانے ہماری معاشرتی زندگی کے آئینے ہیں۔ پھر بھی موضوع کے لحاظ سے ان کو تقسیم کیا جائے تو اجمالاً ان کا خاکہ یوں بنے گا۔ شروع شروع کے افسانوں میں منٹو نے انگریز سامراج کے مظالم اور ان کے خلاف نفرت کو اپنا موضوع بنایا چنانچہ فسادات سے پہلے افسانوں میں جلیانوالہ باغ کے حادثے کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان افسانوں میں آتش پارے، تماشہ، دیوانہ شاعر وغیرہ شامل ہیں۔ جن میں اس واقعہ کے ضمن میں سامراج کے خلاف جواں منٹو کی انقلابی رُوح تڑپتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان افسانوں میں جوش بھی ہے اور جذباتی رنگ بھی۔ منٹو کو غلامی سے شدید نفرت تھی یہی وجہ ہے کہ منٹو کے

افسانوں کی خاصی تعداد سیاسی موضوعات پر مشتمل ہے۔ "سٹوڈنٹ یونین کیمپ" ، "نیا قانون" "ماتمی جلسہ"، "شغل"، "نعرہ"، "موم بتی کے آنسو"، "سُوراج کے لیئے" وغیرہ سیاسی افسانوں کے ذیل میں آتے ہیں۔ منٹو ان افسانوں میں سیاست کو براہِ راست موضوع نہیں بناتے بلکہ برِصغیر کے عام لوگوں کی سمجھ میں سیاست کا جو مفہوم آتا ہے ان کو طنز کی کاٹ کے ساتھ پیش کرتے ہیں البتہ کہیں کہیں کرداروں کے مکالمات سے ہندوستان کے سیاسی مسائل پر براہِ راست تبصرے اور تنقید کا رنگ ملتا ہے۔ بعد میں چچا سام کے نام اس کے خطوط عالمی سیاست کے گرداب، استحصالی حربوں، بڑی طاقتوں کی قلابازیوں اور مکاریوں کی ایسی داستانیں ہیں جن کو عالمی سیاست کی تاریخ کا حصّہ بننا چاہیئے۔

ابتدائی افسانوں میں کچھ ایسے افسانے بھی ملتے ہیں جن کو رُومانی یا رومانی تجربات پر مشتمل افسانے کہا جا سکتا ہے۔ بیگو، ایک خط، لالٹین، مصری کی ڈلی وغیرہ رومانی موضوعات کو اپنے اندر سمیٹے ہُوئے ہیں۔ ان افسانوں میں ایک نوجوان کہانی نگار کی سادگی بھی ہے۔ افلاطونی عشق کا تصور بھی ہے اور جنسی تجربے کی خواہش بھی۔ اس کے بعد منٹو معاشرتی مسائل کی طرف متوجہ ہُوا۔ اخلاقی، سماجی، تمدنی، سوشل اور معاشرے میں پھیلے ہُوئے جنسی مسائل اور گمراہیاں اس کی توجہ کا مرکز بنے۔ ان موضوعات میں طوائف اس کے افسانوں کا مرکزی کردار بنی۔ ہتک، کالی شلوار، پہچان، دس روپے وغیرہ طوائف کے موضوع پر ہیں۔ منٹو نے ان افسانوں میں جنسی لذت کا رس نہیں بھرا بلکہ ان موضوعات کو معاشرتی مسائل کے حوالے سے دیکھا ہے۔

منٹو نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ ان افسانوں میں بلا امتیاز ظالموں کو ظالم اور مظلوموں کو مظلوم دکھایا۔ منٹو بنیادی طور پر انسان دوست ادیب ہے۔ اس لئے وہ اس بات کا امتیاز رکھے بغیر کہ ظالم کس مذہب اور عقیدے کا ہے اس کو ظالم کہتا ہے۔ اسی طرح مظلوم بھی بلا امتیاز رنگ و نسل مظلوم ہے۔ سیاہ حاشیے کے افسانے فسادات کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانوں کے علاوہ کھول دو، ٹھنڈا گوشت، شریفن، وہ لڑکی، موذیل، پرنام کور، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور ریزہ بھی اس ذیل میں آتے ہیں۔ فسادات پر لکھے گئے افسانوں میں اس نے بربریت، ظلم و ستم، جنسی تشدد انسانیت کشی، اخلاقی

بے راہ روی کی تصویریں خوبی سے پیش کی ہیں۔ دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح وہ جذباتی نہیں بن جاتا بلکہ احساس، ضمیر اور انسانیت کو کچوکے لگاتا ہے۔

منٹو کے یہاں نفسیاتی افسانے بھی ملتے ہیں سو کینڈل پاور کا بلب، ننگی تلواریں، سرکنڈوں کے پیچھے، ٹھنڈا گوشت، نفسیاتی معنویت کے حامل افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں رقابت، جنسی گمراہی، پیچیدہ نفسی، زندگی کی بے معنویت جیسے موضوعات موجود ہیں۔

۵

منٹو کی کہانیوں کا ایک بڑا موضوع جنس ہے لیکن یہ اس کی جنس زدگی کا کرشمہ نہیں بلکہ یہ دراصل معاشرے کا احساس پہلو ہے جس کے بارے میں لکھنا ضروری تھا۔ ہمارے معاشرے میں جو گھٹن، ناروا پابندیاں، جبر اور استحصال کا نظام قائم ہے اس میں جنسی گمراہی یا PERVERSION کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ منٹو نے اس PERVERSION پر بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ ٹھنڈا گوشت، بُو، پھاہا، دودا پہلوان، کالی شلوار، اس قسم کی کہانیاں ہیں جن سے ہمارے معاشرے کا یہ پہلو بے نقاب ہوا ہے۔ منٹو کو ہماری بہت سی الجھنوں، نفسیاتی بیماریوں اور جنسی گمراہیوں کا جواز مروجہ غلط نظام اخلاق اور اس کی اقدار میں نظر آیا۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تمنا کرتا ہے جس میں ناروا پابندیاں، خوف، تعزیر و تذلیل اور گھٹن کا پہرہ نہ ہو بلکہ جس میں انسان اپنی جائز خواہشات کی تکمیل آسانی سے کر سکے۔ وہ انسانوں کو صحت مند دیکھنا چاہتا ہے۔ جنس زدگی نے ہمارے معاشرے کو جس قدر کھوکھلا بنایا ہے۔ لوگوں کو ذہنی امراض کا شکار کیا ہے۔ منٹو اس کے خلاف طنز کا نشتر چلاتا ہے۔ کیونکہ وہ خود سٹیٹ فارورڈ، لبرل اور صحت مند دل و دماغ رکھنے والا شخص تھا۔ اس کے یہاں جنس ایک جمالیاتی تجربہ اور رویہ بن جاتی ہے منٹو جنس کو محض جسمانی لذت کا نہیں وجود کی تکمیل اور ترفع (SUBLIMATION) کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ دھواں، بلاوز، پھاہا، ٹھنڈا گوشت، سرکنڈوں کے پیچھے منٹو کے نہایت معروف لیکن بدنام افسانوں میں شمار ہوتے ہیں ان تمام افسانوں میں جنسی نفسیات اور بے راہ روی، انسانی فطرت اور اس کا تلون، زندگی کے پیچیدہ تجربات نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان افسانوں میں سنسنی خیزی بھی ہے اور کھُل کھیلنے کا انداز بھی، ——

عام طور سے منٹو پر فحاشی کا اِلزام لگایا جاتا ہے۔ اس کا نام آتے ہی لوگ کانوں پر انگلیاں رکھتے نظر آتے ہیں۔ لوگ اس کو گالیاں بھی دیتے ہیں اور کوستے بھی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی کہانیاں مزے لے لے کر پڑھتے بھی ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ جب ہم اپنی ہی خباثتوں کو اپنی آنکھوں پر عیاں دیکھتے ہیں تو بے ضمیروں کی طرح ردِ عمل کے طور پر منٹو کو بُرا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ جس نے خود ہمیں بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ ہمارے نام نہاد مہذب لباس کو نوچ کر اتار پھینکتا ہے اور ہمارے عیوب برہنگی اور بدنما داغ ہمیں دکھاتا ہے اور ہم منٹو پر فحاشی اور عُریانی کے الزام عاید کرنے لگتے ہیں اور اسے سنکی اور باغی قرار دے دیتے ہیں لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ منٹو نے معاشرے کو اس کا بدہییت چہرہ دکھایا ہے۔ ہم چاہے اس چہرے کو تکلفات اور رنگ و روغن کی تہوں تلے کتنا ہی چھپائیں۔ منٹو کی ایکس ریز نظروں سے نہیں بچا سکتے۔ منٹو محض خارج کو نہیں ٹٹولتا وہ اشیائے کے باطن میں اُتر جاتا ہے اور اندر کی تاریکیوں کو باہر نکال دیتا ہے۔ اس کا یہ عمل ہمارے لئے ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے کیونکہ ہم نے جھوٹے اور مصنوعی معیار بنا رکھے ہیں۔ وہ معیار جو ایک مخصوص مراعات یافتہ طبقے کے حقوق کی حفاظت کرتے ہیں منٹو اس معیار کا منکر ہے وہ اس معیار کو نہیں مانتا جس نے اکثریت کے حقوق پامال کر رکھے ہیں۔ وہ اس معیار کے خلاف ایک انقلابی کی طرح آواز اُٹھاتا ہے۔

منٹو ایک ایسا حقیقت نگار ہے جو گندگی کے ڈھیر سے ناک پر رومال رکھ کر گذر نہیں جاتا بلکہ وہ وہاں رک جاتا ہے۔ اس ڈھیر کو کریدتا ہے اس میں سے وہ ہماری ترک شدہ اور ٹھکرائی ہوئی چیزوں کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کچرے میں اسے ہماری اخلاقی باختگی، ہماری خام کاری اور ہماری حرام کی کمائی کے نشانات کی تلاش ہوتی ہے۔ ہم اس سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ منٹو بھی تو اس تعفن کو گوارا کرتا ہے اور اس کا آدرش یہ ہے کہ ہم بھی اپنے ضمیر کی آواز سنیں۔ اس کو دبائیں نہیں لیکن اپنے کو سیدھا کرنے کا حوصلہ کسی میں نہیں منٹو کے بس میں ہوتا تو کوڑا لے کر کھڑا ہو جاتا اور ہمیں سیدھی راہ دکھا دیتا لیکن اس کا بس چلا تو اپنے قلم پر اور قلم کے کوڑے سے اس نے ہمارے ذہن پر، ہمارے ضمیر پر ضربیں لگائیں۔ ہم بلبلا اُٹھے اور ردِ عمل کے طور پر اس پر برس پڑے۔ اپنے گناہ اور جُرم ہمیں دکھائی نہ دیئے۔

۶

سعادت حسن منٹو کے یہاں صداقت کی تلاش کا جذبہ شروع سے لیکر آخر تک کارفرما رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ ایک غیر استحصالی معاشرے کی تمنا کی ہے۔ اس نے منافقتوں، خباثتوں، نفرتوں اور کدورتوں سے پُر معاشرے کو نفرت کے ساتھ ٹھکرایا ہے۔ امن، آشتی، شرافت، سچائی اور صداقت کی آرزو کی ہے لیکن سامنے کی حقیقتوں کو ان کے برعکس پایا ہے یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی اس کے یہاں جھنجھلاہٹ اور تلخی بھی شامل ہو جاتی ہے اور تنقید میں بھی بے رحمی آجاتی ہے۔ دراصل ایک صاف دل انسان نہایت شرافت کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے جب معاشرے میں پھیلے ہوئے منفی رویوں سے دوچار ہوتا ہے۔ خلوص کا جواب منافقت سے پاتا ہے۔ اپنی شرافت کے مقابلے میں کمینگی کا مظاہرہ دیکھتا ہے تو اس کی تلخی اور جھنجھلاہٹ بلاجواز نہیں ہوتی۔ ہمارے معاشرے میں صدیوں سے جو استحصالی نظام مسلط رہا ہے اس کے خلاف منٹو کی نفرت اور جھنجھلاہٹ ناجائز نہیں۔ یہ منٹو کا حوصلہ ہے کہ وہ ان تمام رویوں کو کہانی کے روپ میں پیش کر کے اپنے انقلابی جذبے کو تسکین دے دیتا ہے۔ یہ بات ظالم سماج کے حق میں گئی کہ منٹو شرابی تھا۔ شراب کے نشے میں اس نے اپنی تلخیوں کو ڈبو دیا اور اپنی انقلابی حس کو اپنے افسانے کی تلخی میں سمو کر اپنے جذبات کا کتھارسس کر لیا ورنہ کون جانتا ہے کہ وہ کتنا بے رحم انقلابی ہوتا۔ جو انڈرگراؤنڈ تنظیم بنا کر معاشرے کو بھک سے اُڑا دیتا۔ یہ اچھا ہوا کہ اس کے غصے اور جھنجھلاہٹ نے عملی راہ نہ پائی بلکہ قلم کے ذریعے غبار نکال لیا۔

منٹو کا مشاہدہ بڑا حساس اور تیز ہے۔ معاشرے کا کوئی پہلو مثبت یا منفی، اس کے مشاہدے کی گرفت میں آئے بغیر نہیں رہتا۔ اپنی کہانیوں میں وہ سیاسی، سماجی، مذہبی، اقتصادی غرض تمام پہلوؤں کو سمو لیتا ہے۔ ناانصافی اور استحصال کے خلاف اس کے طنز میں اتنی کاٹ اور گہرائی ہوتی ہے کہ جس کی تلخی کو ہمارا ضمیر محسوس کرتا ہے۔ طنز اور IRONY منٹو کا بہت بڑا حربہ ہے۔ جس کے بغیر اس کے اسلوب کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس طنز میں تہذیب و

شائستگی کا وہ معیار نہیں ہے جو نام نہاد "شرفا" نے قائم کر رکھا ہے۔ لیکن اس طنز میں وہ تہذیب اور تمیز موجود ہے جو نیک دل اور مظلوم انسانوں کے لیے مخصوص ہونی چاہیئے۔ ناانصافی اور استحصال پر طنز کرتے ہوئے منٹو تہذیب و شائستگی کے مظاہرے کو جرم اور گناہ سمجھتا ہے۔

منٹو معاشرے کا باغی ہے۔ اس کی بغاوت یقیناً ایک انقلابی کی بغاوت ہے۔ اس کے خاندانی حالات، بچپن کی پرورش و پرداخت اور باپ کی دوسری بیوی کی اولاد ہونے کی حیثیت سے مسائل کا سامنا ایسے عناصر ہیں جنھوں نے منٹو کو باغی بنا دیا۔ منٹو کا ردِ عمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کے دماغ میں بارود بھرا ہے۔ جو پھٹتا ہے تو اس کی کہانیوں کو زہریلا اور کسیلا بنا دیتا ہے لیکن یہ زہر ہلاک کرنے والا نہیں تریاق ہے۔ جو ہمارے جسموں میں، ہماری زندگیوں میں اور ہمارے سماج میں پھیلے ہوئے زہر کو مارتا ہے۔۔۔۔۔

ایک ایسا سماج جو اندر اور باہر سے، باطن اور ظاہر سے، جبر اور استحصال کا شکار ہو۔۔۔۔ جس میں تضادات قدم قدم پر موجود ہوں۔ منافقتیں گھٹی میں پڑ چکی ہوں، جہاں دولت، مذہب اور سیاست کو ایکسپلائٹیشن کا ذریعہ بنایا جائے وہاں ایک فن کار کا ان تمام رویّوں کا حقیقت پسندانہ مطالعہ، انکشاف اور اظہار خدمت سے کم نہیں ۔۔۔۔۔ وہ انسانی زندگی کی نئی نئی حقیقتوں کو منکشف کرنے کا فن جانتا تھا اور اسی انکشاف کے شوق نے اُسے شعبدہ باز بھی بنایا۔ وہ اچھے بھلے واقعات کو شعبدوں میں تبدیل کر کے ہمیں چونکا دینے کا اس قدر شوقین تھا کہ اس کے بعض افسانے اس ناقابلِ فہم انکشاف کی مشق ستم کا نشانہ بنے ہیں بلکہ اسے لوگوں کو چونکانے اور "متحیر" کر دینے کا چسکا پڑ گیا اور اس کے بہت سے افسانے اس چسکے کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئے۔

۷

منٹو نے بہت لکھا، بسیار نویسی نے اس کے فن کے معیار کو متاثر کیا۔ اس کے یہاں بُری کہانیاں بھی ملتی ہیں جن کا ادب میں کوئی مقام نہیں اور نہ ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن قصور منٹو کا نہیں اس کی احتیاج کا ہے۔ معاشرے نے اسے کہانی کے عوض چند ٹکے دیئے،

جس کے ذریعے نہ صرف اپنے بیوی اور بچوں کی اشتہاء بجھاتا تھا بلکہ اپنے غموں کو پگھلاتا تھا اور اپنے آپ کو جلانے کی خاطر شراب بھی پیتا تھا لیکن اپنے فن کی اتنی ارزاں قیمت پر دہ دلائی نہیں دیسی اور خانہ ساز شراب پی پی کر گھلتا گیا۔ اچھا ہُوا کہ منٹو مر گیا ورنہ اس پر معلوم نہیں کتنے اور مقدمے کھڑے کئے جاتے۔ نام نہاد مہذب معاشرے نے اس کی کتنی کہانیوں کو عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔ لیکن وہ یہ بھول گیا کہ ادب عدالت کے کٹہرے میں نہیں ضمیر کی عدالتوں میں جگہ پانے کے قابل ہوتا ہے۔ منٹو کی تذلیل دراصل معاشرے کی اپنی تذلیل ہے کیونکہ اس نے معاشرے کو وہی کچھ لوٹایا جو کچھ اسے دکھایا گیا یا دیا گیا۔ اس نے معاشرے کو ویسا ہی پیش کیا جیسا وہ تھا۔ اس لئے سچ بولنے پر اسے زہر کا پیالہ پینا پڑا اور وہ کسی معذرت خواہی کے بغیر سچ کی صلیب پر چڑھ گیا منٹو کی کہانیاں ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔ غیر ملکی ادب کے مقابلے میں ہم ان کہانیوں کو بڑے فخر سے پیش کر سکتے ہیں۔ منٹو کے تراجم آج دُنیا کی مختلف زبانوں میں کئے جا رہے ہیں۔ کئی ملکوں میں اس کی عظمت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن جب تک منٹو زندہ رہا ہم نے اس کے فن کو اس طرح چھپائے رکھا جیسے وہ ہماری حرام کی کمائی ہو یا سمگلنگ کا مال ہو۔ منٹو نے پبلشروں اور رسالوں کے مدیروں کو اپنی کہانیاں کتنی ارزاں بیچی ہیں لیکن ان مدیروں اور پبلشروں نے ان کی کہانیاں بیچ کر ہزاروں کمائے۔ منٹو نے ان کی مادی احتیاج بھی پُوری کی لیکن اس کی جائز احتیاج کوئی بھی پُوری نہ کر سکا۔

بسیار نویسی کے ساتھ ساتھ منٹو کے فنی اسلوب میں غیر متوقع انجام سب سے نمایاں ہے۔ منٹو اپنے افسانوں میں غیر متوقع انجام پیش کرنے کا بڑا شوقین تھا۔ واقعات کا بہاؤ کہیں اور جا رہا ہو گا تو انجام کوئی اور ہو گا۔ قاری کو متحیر کرنا اور اچانک جھٹکا دینا منٹو کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ اس طرح ڈرامائیت اور چونکا دینے والی صُورتِ حال وہ جا بجا پیدا کرتا ہے۔ طنز اور (IRONY) منٹو کے اسلوب کا بہت بڑا حربہ ہے۔ طنز اور (IRONY) کے استعمال میں جو مہارت اور ہُنر مندی منٹو کو حاصل ہے اس کی مثال اُردو ادب میں کہیں نہیں ملتی۔ منٹو کا اسلوب موضوع کو اپنے اندر ڈھال لیتا ہے اور خُود موضوع میں ڈھل جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منٹو لفظوں کی معنویت کو سمجھتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے لفظی

حرمت کو قائم رکھا اور کفایت لفظی سے صحیح معنوں میں کام لیا۔

مختصر یہ کہ موضوع اور فن کے لحاظ سے منٹو کے افسانے اُردو ادب کے افسانوی ذخیرے میں ایک بیش بہا اور قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی اہمیت کو نہ پہچاننا بدمذاقی بھی ہے اور کوتاہ اندیشی بھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ منٹو کو بھی اقبال کی طرح قومی ہیرو قرار دیا جائے کہ اس کے افسانے ہماری قومی تاریخ کی وہ سچی دستاویزات ہیں جن کو ضائع کرنا قومی تاریخ کے ضیاع کے مترادف ہے۔ منٹو کے افسانے ہمارا قومی ورثہ ہیں۔

منٹو کا فن، اپنے نمائندہ افسانوں کی روشنی میں

ڈاکٹر انوار احمد

منٹو نے مشہور اشتراکی ادیب باری علیگ کے خاکے میں لکھا ہے "یہ حقیقت ہے کہ مجھے تحریر و تصنیف کے راستے پر ڈالنے والے وہی تھے، اگر امرتسر میں میری ملاقات نہ ہوتی، تو ہو سکتا ہے کہ میں غیر معروف آدمی کی حیثیت سے مرکھپ گیا ہوتا، یا چوری ڈکیتی کے جرم میں لمبی قید کاٹ رہا ہوتا" (گنجے فرشتے، ص ۱۷) باری نے ہی منٹو سے ہیوگو اور آسکر وائلڈ کی ناولوں کا ترجمہ کرایا اور طالسطائی، گوگول، دوستوفسکی، ترجنیف، پشکن اور گورکی کی تخلیقات کی جانب متوجہ کیا، بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں برصغیر کے پرجوش نوجوان 'دہشت گردی' اور انقلابی رومانویت کو آزادی کا محفوظ راستہ خیال کرتے تھے، منٹو نے بھی اپنے کمرے کا نام 'دارالاحمر' رکھا ہوا تھا اور بطلِ حریت بھگت سنگھ کے مجسمے کو اسی کمرے میں سجا رکھا تھا (منٹو میٹرک کا طالب علم تھا، جب بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی۔ ۳۱-۱۹۳۱ء) جنوری ۱۹۳۴ء کے 'ہمایوں' میں منٹو کے مندرجہ ذیل روسی تراجم شائع ہوئے۔ ۱- پتھر کی سرگذشت، ۲- شراب اور شیطان (طالسطائی) ۳- چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ (گورکی)، ۴- سیاہی اور موت (روسی لوک کہانی) ۵- جادوگر (چیخوف) ۔۔۔ مئی ۱۹۳۵ء میں 'ہمایوں' کا روسی ادب نمبر (جلد ۲۷، شمارہ ۵) شائع ہوا، اس میں کل ۲۶ تراجم شامل تھے، جن میں سے ۱۴ سعادت حسن منٹو کے ہیں، اس کے بعد 'گورکی کے افسانے'، اور 'روسی افسانے'

کے نام سے منٹو کے تراجم شائع ہوئے اور پھر 'عالمگیر' کا معرکۃ الآرا روسی ادب نمبر شائع ہوا، جس میں منٹو کے علاوہ حامد علی خاں، منصور احمد، پروفیسر مجیب، کامریڈ فیروز الدین منصور، شاہد لطیف اور فیض احمد فیض کے تراجم شامل ہیں، منٹو کے تراجم کے عنوانات ہی ملاحظہ کیجئے ۱۔میکسم گورکی، ۲۔سُرخ انقلاب ۳۔کارل مارکس ۴۔کسان، مزدور، سرمایہ دار، زمیندار' (پہلا، دوسرا اور چوتھا مضمون 'منٹو کے مضامین' میں اور تیسرا 'تلخ، ترش اور شیریں' میں شامل ہے)

اس تمہید کا مقصود یہ تھا کہ وہ ذہنی اور جذباتی واردات، فکری محرکات اور سیاسی و سماجی میلانات اُبھر کر سامنے آجائیں، جن کے بطن سے منٹو کے پہلے افسانے (تماشا) اور پہلے افسانوی مجموعے (آتش پارے) نے جنم لیا' ــــــ اس مجموعے میں سے تماشا اور 'چوری' کا انتخاب کیا گیا ہے' ــــــ

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں نہتے شہریوں پہ جنرل ڈائر اور اس کے فوجی دستے نے گولیاں چلانا شروع کیں اور اس وقت فائرنگ بند کی جب اسلحہ ختم ہو گیا اور بعض تخمینوں کے مطابق دو ہزار افراد ہلاک ہوئے ــــــ منٹو سات برس کا تھا جب یہ سانحہ پیش آیا، اور یہ امر معنی خیز ہے کہ اس کا پہلا افسانہ اسی سانحے کے بارے میں ہے اور یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ منٹو نے افسانے کے مرکزی واقعے کو ایک بچے (خالد) کی نظر سے دکھایا ہے' اس افسانے میں ایک بڑے افسانہ نگار کے تخلیقی شعور کی اُٹھان موجود ہے، مگر ایک آدھ موقع پر افسانہ نگار کا اضطراب بہت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے" کاش! انتقام کا یہی ننھا جذبہ ہر شخص میں تقسیم ہو جائے" ــــــ اسی طرح اس افسانے میں انشا پردازی کے جوہر دکھانے کی وہ تمنا بھی موجود ہے، جو رومانوی ادبی تحریک کے زیرِ اثر ادبیت کی پہچان بن گئی تھی' جلیانوالہ باغ کا سانحہ بعد میں بھی منٹو کے افسانوں کا موضوع بنا، '۱۹۱۹ء کی بات' کے علاوہ 'سوراج کیلئے' کا ابتدائی حصہ اسی آسیب کی یاد تازہ کرتا ہے' ــــــ

'چوری' فنی اعتبار سے زیادہ پختہ افسانہ ہے، ایک بوڑھا بچوں کو اس ملیجے کی رُوداد سناتا ہے، جب محرومی اور افلاس کے ساتھ ساتھ مطالعے کے شوق سے مجبور ہو کر اس نے کتاب

چرائی تھی اور پکڑا گیا تھا، کتب فروش کے معاف کرنے پر وہ نادم ہوتا ہے اور بعد کی چوریوں پر فخر کرتا ہے کہ ایک طرف تو اس کا مؤقف ہے کہ "ہر وہ چیز جو تم سے چُرالی گئی ہو، تمہیں حق حاصل ہے کہ اسے ہر ممکن طریقے سے اپنے قبضے میں لے آؤ، مگر یاد رہے تمہاری یہ کوشش کامیاب ہونی چاہیئے، ورنہ ایسا کرتے ہوئے پکڑے جانا اور اذیتیں اُٹھانا عبث ہے" اور دُوسرے یہ ناقص نظامِ تعزیرات اور ناہموار و غیر منصف سماجی نظام کے خلاف مزاحمت کا اقدام ہے جس نے جرم و سزا کے معاملہ کو پیچیدہ بنا دیا ہے' اس سلسلے میں منٹو پر وکٹر ہیوگو کے خیالات و نظریات کا بہت گہرا اثر ہے' ـــــــــ

منٹو نے 'چوری' سے کم و بیش ۱۴ برس بعد 'ساڑھے تین آنے' تخلیق کیا' اس افسانے کا موضوع بھی یہی 'جرم و سزا' کا مسئلہ ہے' اس میں وکٹر ہیوگو کا نام لے کر 'سرگذشت اسیر' کا وہ معروف فقرہ دُہرایا گیا ہے "وہ سیڑھی اتار دو' جو انسان کو جرائم اور مصائب کی طرف لے جاتی ہے" اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ "انسان سے خُود جرم سرزد نہیں ہوتا، حالات سے ہوتا ہے"، اسی افسانے میں منٹو نے 'پھگو بھنگی کی خوشبودار فطرت' کا ذکر کر کے انسان کی فطرت پر اپنے ناقابلِ شکست رجائی نصب العین کا اعادہ کیا ہے' اور خُود کو افسانے میں شامل کر کے 'فسانے کی حقیقت سے' وہ قربت پیدا کی ہے' جو 'امراؤ جان ادا' میں مرزا رسواء کا مقصود تھا (منٹو کے ایسے بہت سے افسانے ہیں' جن میں وہ اپنے نام کے ساتھ موجُود ہے' اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں' التباسِ حقیقت' خود پسندی، خالق و تخلیق کی یکجائی کا نمود)

'نیا قانون' اُردو کے شاہکار افسانوں میں سے ہے' یہ افسانہ ۱۹۳۸ء کے 'ہمایوں' میں شائع ہُوا' اس میں برطانیہ کی ان آئینی مراعات' پر زہر خند کی برق پاشی کی گئی ہے جو ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت نو آبادی کی رعایا کو دی گئی تھی ـــــــــ اس افسانے میں منٹو کے سیاسی و سماجی شعُور میں نفسیاتی شعُور اور فنی ریاضت و معروضیت گھُل مل گئے ہیں، استاد منگو، عالمی ادب کے زندہ جاوید کرداروں میں سے ہے' وہ برِ صغیر کے معصُوم انسانوں کا نمائندہ ہے' جو غلامی اور استحصال سے نفرت تو کرتے ہیں، مگر اس کے اظہار کے لیئے مناسب موقع کی تلاش

میں رہتے ہیں، پھر ان کی خبر اور بے خبری میں زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا، مگر ان کے خواب اور تعبیر میں بہت فاصلہ ہوتا ہے" ـــــ یکم اپریل منگو کی زندگی کا بظاہر غیر معمولی دن ہے کہ نئے قانون کے نفاذ کا دن ہے، مگر جب وہ ایک گورے کی ٹھکائی کر کے حوالات پہنچتا ہے تو معمول سے عذاب کا در کھلتا ہے۔ "نیا قانون، نیا قانون، کیا بک رہے ہو، قانون وہی ہے پرانا" ـــــ منگو کا سیاسی و سماجی احساس اور علم (جس کے مطابق روس والا بادشاہ انگریزوں کو نیا قانون لانے پر مجبور کر رہا ہے) ہر طرح کی سواریوں کے قابلِ فہم مکالموں کے ساتھ مل کر افسانے کی معنویت کو بڑھا دیتا ہے۔ ـــــ ذاتی سطح پر منگو کا اضطراب (متوقع بچے کے سلسلے میں) یکم اپریل سے متعلق اس کے انتظار کی شدت کو قرینِ قیاس بناتا ہے، اس افسانے کے ساتھ ہی اردو زبان میں ایک عظیم افسانہ نگار کی پرشکوہ آمد کی گونج سنائی دی، ایسا افسانہ نگار جو غلام ہند میں برطانوی سامراج کو للکارنے کی جرأت بھی رکھتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کمال صناعی کے ساتھ ایسی افسانوی کائنات تخلیق کرنے کی صلاحیت بھی، جس میں کردار، حقیقی زندگی کے کرداروں سے بھی زیادہ حقیقی دکھائی دیں۔ ـــــ

'نعرہ' منٹو کا سب سے بلند آہنگ افسانہ ہونے کے باوجود مجروح انا کی سائیکی کی موثر تصویر کشی کرتا ہے، اس افسانے میں منٹو کا لب و لہجہ ڈرامائی ہی نہیں رمزی بھی ہے" وہ اپنا سر جھکا کر اور اپنے آپ کو اندھیرے میں لپیٹ کر، مالک مکان کے اس روشن کمرے میں داخل ہوا، جہاں وہ اپنی دو بلڈنگوں کا کرایہ وصول کرتا تھا، اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا، سیٹھ کے تلک لگے ماتھے پر کئی سلوٹیں پڑ گئیں" ـــــ "کیشو لال سیٹھ جی سے ہمدردی مانگنے آیا تھا، جواب میں اُسے دو گالیاں ملیں، اس کے بے بس ردِ عمل نے اس کے اندر اور بھی کھلبلی مچا دی۔" جب اُس کے سامنے ایک موٹر نے اپنے ماتھے کی بتیاں روشن کیں، تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ دو گالیاں پگھل کر اس کی آنکھوں میں دھنس گئی ہیں"، جذبۂ انتقام اور بے بسی کی کشمکش میں مجروح انا جو سمجھوتے کا راستہ منتخب کرتی ہے' وہ یہی ہے کہ "اس عالی شان ہوٹل کے نیچے کھڑا ہو گیا، اس برقی بورڈ کے عین نیچے قدم گاڑ کر اس نے اوپر دیکھا، سنگین عمارت کی طرف، جس کے روشن کمرے چمک رہے تھے اور اس کے حلق سے ایک نعرہ کان کے پردے

پھاڑ دینے والا نعرہ، پگھلے ہوئے گرم گرم لاوے کے مانند نکلا، ہمت تیری ...... "

اس افسانے کا قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ غریب کو بھی عزتِ نفس کی پامالی کا احساس ہو سکتا ہے، مگر اس کی بے بسی مزاحمت کے جذبے کو خود فریب سمجھوتے کی راہ پر ڈال سکتی ہے ـــــ

وقت کے ساتھ ساتھ منٹو کی دلچسپی اس فطری آدمی سے بڑھتی گئی، جسے رسوم و رواج، اخلاق، مدنیت کے تقاضوں اور تہذیب کے دباؤ نے 'معمولی' بنا دیا تھا اور وہ اپنی ازسرِ نو دریافت کی خاطر 'غیر معمولی' بننے کا خواہاں تھا، یا یوں سمجھئے کہ وہ منہدم یا مسخ کر دیا گیا تھا اور اب اپنی تعمیر آپ کرنے کے ایسے جتن میں مبتلا تھا، جسے بعض لوگ مکروہ یا ناپسندیدہ خیال کرتے ہیں۔ 'ٹیڑھی لکیر' کا مرکزی کردار، 'پانچ دن' کا پروفیسر، 'ڈرپوک' کا شکر بجالانے والا کردار، اور 'میرا نام رادھا ہے' کا راج کشور ایسے رویّے کی تفہیم کی محض چند مثالیں ہیں۔ 'بانجھ' بھی اسی ذیل میں آتا ہے، وہ خلوص سے جھوٹ بولتا ہے اور محبت کے بانجھ پن کو زرخیزی کے فریب میں بدلنے کا خواہاں ہے۔ منٹو کے الفاظ میں "جس طرح عورت کا حمل گر جاتا ہے، اسی طرح محبت بھی گر جاتی ہے، بعض دفعہ بانجھ پن پیدا ہو جاتا ہے ...... جس طرح عورت اپنے جسمانی نقائص کے باعث بچے پیدا کرنے قابل نہیں رہتی، اسی طرح یہ لوگ چند روحانی نقائص کی وجہ سے کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے کی قوت نہیں رکھتے" ـــــ اس افسانے کے اختتام پر پہلے سے معلوم حقیقت کی وضاحت کے لئے مرکزی کردار کے جس 'ڈرامائی' خط کا سہارا لیا گیا ہے، وہ بے حد کمزور ہے ـــــ

منٹو اپنے ایک مضمون عصمت فروشی میں لکھتا ہے۔ "یہ عورتیں (طوائفیں) اُجڑے ہوئے باغ ہیں، گھورے ہیں، جن پر گندے پانی کی موریاں بہہ رہی ہوں، یہ ان گندی موریوں پر زندہ رہتی ہیں ...... دل ایسی شے نہیں جو بانٹی جا سکے اور مرد کے مقابلے پر عورت کم ہرجائی ہوتی ہے، چونکہ ویشیا عورت ہے، اس لئے وہ اپنا دل تمام گاہکوں میں تقسیم نہیں کر سکتی۔" (منٹو کے مضامین، ص ۱۵۰ اور ص ۱۶۶) اسی طرح جوگیشوری کالج بمبئی کی بزم ادب سے خطاب کرتے ہوئے منٹو نے کہا تھا۔

"چکی پیسنے والی عورت، جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے، میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی، میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے،

جورات کر جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اُٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آرہا ہے۔ اس کے بھاری بھاری پپوٹے، جن پر برسوں کی اچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہوگئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں، اس کی غلاظت، اس کی بیماریاں، اس کا چڑچڑاپن، اس کی گالیاں، یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔" (لذتِ سنگ، ص ۱۹)

اس کوچے میں 'ہتک' کی سوگندھی بیٹھی ہے، فوجا بھائی، سراج، شاردا، جانکی، سلطانہ شانتی، لتا اور زینت ہے تو خوشیا، صادق خان اور شنکر بھی، مگر میرے خیال میں طوائف کے موضوع پر 'ہتک' اور 'کالی شلوار' کو منٹو کے نمائندہ افسانے قرار دیا جا سکتا ہے، حالانکہ دونوں افسانوں کی فضا میں بہت فاصلہ دکھائی دیتا ہے ــــــــ

'ہتک' کی افسانوی بنیاد پر سید عابد علی عابد کو یہ اعتراض ہے کہ طوائف کے لئے تو 'ہتک' معمول کی بات ہے، اس لئے سوگندھی کا غیر معمولی ردِ عمل کیوں (اصول انتقادِ ادبیات ص ۶۲۲، ۶۲۳) ماجرا یہ ہے کہ ناول نگار کے مقابلے میں افسانہ نگار کسی کردار کی زندگی کے کسی معنی خیز لمحے کا اِنتخاب کرتا ہے، یا دیا منظر یا واقعے کے سلسلے کی ایک کڑی پر توجہ مرکوز کرتا ہے، اس لئے 'ہتک' میں تماشبین کی 'اُونہہ' سوگندھی کی زندگی کا وہ لمحہ بن جاتا ہے، جب اس کا غیظ و غضب مردانہ سماج کے واجب الادا قرضے کی سود سمیت ادائیگی بن کے اخراج پاتا ہے، سوگندھی کی زندگی میں ایسے ایک ہزار لمحے آئے ہوں گے، مگر اس لمحے کی معنویت 'اونہہ' کا سامنا کرنے سے پہلے کی سوگندھی کی کھولی میں اُتری جبر کی رات میں تلاش کی جائے اور اسی 'اُونہہ' کے بعد خود فریبی کا وہ پردہ بھی چاک ہو جاتا ہے، جو مادھو کی صورت میں اُس نے اپنی غلیظ کھولی کی دہلیز پر لٹکا رکھا تھا ــــــ تھوکوں سے لتھڑی ہوئی چولی، بدبو دار بستر، مکروہ کھولی، ننگے ہوئے بدن کو ٹٹولنے والی روشنی، مُنہ کی کڑواہٹ اور خارش زدہ کتا! ان سب امیجز نے مل کر ایسی وحشت ناک تصویر بنائی ہے کہ اُردو میں اِس کے مقابلے کا کوئی افسانہ نہیں' ــــــــ

'کالی شلوار' پر مقدمہ چلایا گیا تھا، اس پر بے حد تعجب ہوتا ہے، ممکن ہے بعض لوگوں نے اسے 'کھول دو' کا پہلا حصہ سمجھا ہو ــــــــ حالانکہ یہ طوائف کے موضوع پر لکھے جانے والے اُردو کے 'بے ضرر ترین' افسانوں میں سے ایک ہے ــ دراصل منٹو کے ساتھ

مسئلہ یہ ہے کہ اس کی طوائف خانم، بسم اللہ جان، خورشید یا امراؤ جان ادا نہیں، اس کی طوائف تو پریم چند کی سمن بھی نہیں، یہ تو طوائف کی دنیا کے نچلے یا محروم طبقے کی ایک فرد ہوتی ہے، گلی کی بدرو میں رینگنے والا ایک حقیر کیڑا، اس لیے مقدمہ چلانے والوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی ہوگی کہ آخر کالی شلوار کی سلطانہ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے بھی محتاج کیوں ہے، ہم خدا بخش کا کیمرہ اس کی زندگی میں قلم کے بغیر چل رہا ہے، محرم کے موقع پر اسے کالی شلوار کی ضرورت ہے، جو شنکر نہایت مہارت کے ساتھ پوری کر دیتا ہے، اسے بس ایک طوائف کی ضرورت کا تبادلہ دوسری طوائف کی احتیاج سے کرنا پڑتا ہے' ——

'بابو گوپی ناتھ' منٹو کا لازوال افسانہ ہے، وہ طوائف کے وجود میں تو ماں کی تجسیم دکھا چکا تھا، مگر ایک رنڈی باز کے معصوم بطن اور پاکباز روح کا جلوہ بابو گوپی ناتھ کے کردار میں ہی دکھائی دیتا ہے، ممتاز شیریں نے اپنے ایک مضمون 'معصیت و معصومیت۔ انسان کا تصور منٹو کے افسانوں میں' میں لکھا ہے 'بابو گوپی ناتھ جو کچھ بھی کرتا ہے، بڑے خلوص سے کرتا ہے' یہاں تک کہ اس کے اپنے آپ کو دھوکا دینے میں بھی ایک طرح کا خلوص ہے..... زینت ایک انفعالی کردار ہے، اس کی سادہ پر خلوص ہستی بجائے خود ایک آئینہ بن گئی ہے، جس میں بابو گوپی ناتھ کے خلوص، فیاضی اور وسیع القلبی کا عکس پڑتا ہے۔" (سویرا، شمارہ ۱۰، ۱۱، ص ۲۰۱، ۲۰۲) بابو گوپی ناتھ کو رنڈی کے کوٹھے اور پیر کے مزار پر سکون ملتا ہے، مگر اس کی زندگی میں عظمت اور طہارت کا لمحہ تب نازل ہوتا ہے، جب وہ اپنی محبوبہ زینت کی شادی کسی شریف آدمی سے کرتا ہے' اس افسانے کو کرداری افسانہ کہا جاتا ہے، مگر اس کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ اس دنیا کے ہر رویے، ہر روپ اور ہر امکان کو کسی نہ کسی کردار میں ظاہر کیا گیا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ بابو گوپی ناتھ کا ظرف ہر قسم کی گدلاہٹ کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے'

—— 'حافظ حسن دین' بظاہر منٹو کے ان افسانوں میں سے ہے، جس کی بنیاد کسی چٹکلے پر ہوتی ہے، مگر اس کے چاروں کردار حافظ حسن دین، ظفر شاہ، رمضان علی اور بلقیس نہایت دلچسپ ہیں، افسانے کا آغاز حافظ حسن دین کی دونوں آنکھوں کی بے نوری کے ذکر سے ہوتا ہے، مگر رفتہ رفتہ احساس ہوتا ہے کہ اصل پٹی تو ضعیف الاعتقادی کی آنکھوں پر بندھی ہوئی ہے، ظفر شاہ

کو اُدھورا ستید ہونے کا احساس ہے اور بظاہر یہ اکلوتا راستہ اسے نقب لگانے کا ہے، مگر وہ ان لوگوں میں سے ہے، جو بے وقوف ہوتے ہیں، بنائے نہیں جاتے، رمضان علی، حافظ حسن دین کے جلالی لمحوں میں مونگ پھلی کھاتا ہے اور خود حافظ حسن دین، ظفر علی کے ہیجانی لمحوں میں چلغوزے اور بلقیس انتظار کے احترام میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی!

عزیز احمد نے اپنی کتاب 'ترقی پسند ادب' میں منٹو کے ہاں انسان دوستی کے فقدان کا ذکر کیا ہے "اس میں انسانیت کا راسخ عقیدہ کہیں نظر نہیں آتا، انسان اور انسان دوستی، ہمدردی، رفاقت، محبت جس پر اچھے انقلابی فلسفے کی بنیاد ہے، ان کے یہاں نہیں"——
حالانکہ منٹو کے تصورِ انسان کے حقیقی مظہر افسانوں سے بھی صرف نظر کر لیا جائے تو محض 'منتر'، 'ٹوٹو' اور 'منظور' کا مطالعہ ہی بچوں سے منٹو کی ایک معنوی وابستگی کو ظاہر کرتا ہے، جو نسلِ آدم کی معصومیت اور محبت زا شخصیت پر منٹو کے ہی نہیں ہمارے اعتماد کو بھی بڑھاتی ہے، 'ٹوٹو' کا آغاز ان سطور سے ہوتا ہے "میں سوچ رہا تھا، دنیا کی سب سے پہلی عورت، جب ماں بنی تو کائنات کا ردِ عمل کیا تھا؟ دنیا کے سب سے پہلے مرد نے کیا آسمانوں کی طرف تمتماتی آنکھوں سے دیکھ کر دنیا کی سب سے پہلی زبان میں بڑے فخر کے ساتھ یہ نہیں کہا تھا، میں بھی خالق ہوں"——طاہرہ اور عطا یزدانی میں جب کبھی جھگڑا ہوتا تو سات آٹھ ماہ تک وہ بچہ (ٹوٹو) چپکا رہتا ہے، جو ابھی پیٹ ہی میں ہے اور پھر جب طاہرہ کی مُردہ لڑکی پیدا ہوتی ہے تو کہانی کا متکلم سوال کرتا ہے" اگر اب طاہرہ اور عطا کا جھگڑا ہوا تو اسے کون ٹوٹو چپکائے گا"——

یہی نہیں منٹو کے بہت سے غیر معمولی کرداروں کا سحر ان کی معصومیت اور بھولپن میں ہے، 'ممد بھائی' اس کی بہترین مثال ہے، ممد بھائی کے خدوخال نرم اور ملائم ہیں مگر مونچھیں بے حد خوفناک، اس نے قاتل چھری پیٹ کے ساتھ باندھ رکھی ہے، مگر کسی کو انجکشن لگتے نہیں دیکھ سکتا، وہ علاقے کا بدنام غنڈہ ہے مگر بیماروں، ضرورت مندوں اور کمزوروں کا خیال رکھتا ہے، وہ بے حد نڈر ہے، مگر عدالت کے پہلے فیصلے سے خوفزدہ ہے، آخر میں مونچھوں کے بغیر اپنے آپ کو گالیاں دیتا، دوہتڑ مارتا 'ممد بھائی' علاقے کا دادا نہیں، 'پوتا' دکھائی دیتا ہے"——

منٹو کے مضامین میں 'ایک اشک آلود اپیل' کا عنوان ہی نہیں، لب و لہجہ بھی بے حد جذباتی ہے، مگر فسادات، ۱۹۴۷ء سے متعلق یہ منٹو کے نقطۂ نظر کا براہِ راست اظہار ہے' ایک اقتباس دیکھئے :

قصرِ آزادی کی تعمیر فرقہ وارانہ فسادات کے شکار انسانوں کے لہو اور خود غرض لیڈروں کے نمائشی پروپیگنڈے سے نہیں ہو سکتی" (ص ۸۹)

بمبئی کے شہریوں کے نام منٹو کی اس اپیل کے پیچھے ممکن ہے کہ وقتی اور مقامی مصلحتیں بھی ہوں، مگر ایک ایک لفظ کے پیچھے منٹو کا کرب بول رہا ہے، اس لئے فسادات سے متعلق منٹو کے رویے کو انسان دشمن رویہ کہنا (ممتاز حسین — نئی قدریں) بجائے خود بے دردی ہے' ہاں منٹو تخلیقی عمل میں فارمولوں کی حکمرانی کا قائل نہیں تھا، وہ انسان کو وقتی اور ہنگامی اخلاق یا سیاسی مقاصد کے تابع بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جانتا تھا، کہ بڑے سے بڑے سانحے کا ادبی اظہار بے درد معروضیت کا تقاضا کرتا ہے، اس لئے فسادات سے متعلق منٹو کا عمومی رویہ سطحی، جذباتی یا ہنگامی نہیں۔ محمد حسن عسکری نے 'سیاہ حاشیے' پر یوں حاشیہ آرائی کی ہے۔" نہ انہوں نے ظالموں پر لعنت بھیجی، نہ مظلوموں پر آنسو بہائے ہیں' انہوں نے تو یہ تک فیصلہ نہیں کیا کہ ظالم لوگ بُرے ہیں یا مظلوم اچھے ہیں۔" (ص ۱۲)
میرے خیال میں یہ بات درست نہیں، منٹو نے قاتلوں کے سامنے آئینہ رکھ دیا ہے جس میں ان کی بربریت اور انسانی فطرت کی کشاکش کی پیچیدہ تصویر واضح طور پر دکھائی دیتی ہے' منٹو کسی بھی موقع پر انسان دوستی کا رویہ ترک نہیں کرتا، یہ اور بات ہے کہ اس کے زہر خند کی رمزیت میں ظالم، مظلوم اور ظلم ملفوف ہیں اور اپنے معاصرین کی طرح کھلے اشارے نہیں کرتا۔ منٹو نے تو 'سیاہ حاشیے' اس آدمی کے نام معنون کی ہے جس نے اپنی خونریزیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا "جب میں نے ایک بڑھیا کو مارا، تو مجھے ایسا لگا، مجھ سے قتل ہو گیا ہے"

فسادات پر منٹو کے اہم افسانے حسب ذیل ہیں۔ 'کھول دو'۔ 'شریفن'۔ 'عزت کے لئے'۔ 'ڈارلنگ'۔ 'ٹھنڈا گوشت'۔ 'سہائے'۔ 'رام کھلاون'۔ 'وہ لڑکی'۔ 'گورمکھ سنگھ کی وصیت'

اور موذیل' ——

منٹو کے ہاں یہ بات بطورِ خاص دکھائی دیتی ہے کہ وہ سکھّوں پر لکھتے وقت فن کی بلندیاں کو چھو لیتا ہے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ان کے کلچر اور عادات سے واقف ہے، بلکہ اُن کی رُوح میں اُترنا جانتا ہے، پھر منٹو جس طرح لفظی اور سماجی مطالعے میں ستم ظریفی کی صورتِ حال پیدا کر لیتا ہے، اس کے لئے کسی کا سکھ ہونا، اپنے مقصد کے حصُول میں سہولت پیدا کرتا ہے، "گورمکھ سنگھ کی وصیّت" سیاہ حاشیے کی معنوی توسیع ہے، قاتلوں کی سفاک معصومیّت اس افسانے کا موضوع ہے —— 'موذیل' درحقیقت کرداری افسانہ ہے اور وہ 'ممی'، 'جانکی' اور 'شاردا' سے بھی بڑا کردار ہے —— جانکی، شاردا اور ممی کسی کے لئے اپنی محبت اور ممتا کی شہادت لہو سے تو نہیں دیتے، جب کہ 'موذیل' ترلوچن سنگھ (ایک اور سکھ کردار) کے لئے یہ کر گزرتی ہے، ترلوچن، موذیل کی خاطر کیس کٹوا دیتا ہے، مگر پگڑی نہیں آتارتا، ہاں دم توڑتی موذیل کے برہنہ بدن پر اپنی پگڑی پھیلا دیتا ہے، وہاں موذیل نہیں، منٹو تلملا کے کہتا ہے "لے جاؤ اس کو ..... اپنے اس مذہب کو" —— فسادات پر سب سے مؤثر اور سنگین کہانی 'کھول دو' ہے عام طور پر افسانہ نگاروں نے اس موقع پر یا تو ستر پوشی کی ہے یا پھر زخموں کی نمائش، یہاں منٹو کے فن میں ان مجسمہ سازوں اور مصوّروں کا ہُنر اور جوہر جذب ہو گیا ہے، جو مقدس عورتوں کے برہنہ مجسمے یا تصویریں بناتے ہیں مگر ان کی تخلیقات کی معصومیّت سفلی جذبات کو برانگیختہ نہیں ہونے دیتی —— سکینہ برِّ صغیر کی بیٹی ہے، جسے قطار باندھ کر لُوٹا گیا ہے، سرحد کے اس پار بھی اور اس پار بھی، مگر معراج الدین، منٹو کا پسندیدہ فرد ہے، جو سکینہ کی صورت میں عزّت کی لاشں کو نہیں، انسانیت کی آس کو لیے پھرتا ہے اور یہ ڈاکٹر بھی بلوائیوں اور رضاکاروں سے مختلف ہے کہ ایک لڑکی کو شلوار اتارتے دیکھ کر پسینے میں ڈُوب جاتا ہے —— 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' ایک نہایت پیچیدہ صورتِ حال کا افسانہ ہے، جس میں ذاتی بیچاک پر اجتماعی بیچاک اور نفسی انتشار پر سیاسی و ثقافتی انتشار غالب آجاتا ہے، اس موقع کی دیوانگی کے پیشِ نظر پاگل خانے کا LOCALE بے پناہ معنویت کا حامل نظر آتا ہے۔

'پھولوں کی سازش' پر پہلی نظر میں انشائیے لطیف کا گماں ہوتا ہے مگر اس کا بغور مطالعہ اسے اُردو کے اوّلین علامتی افسانوں میں شمولیت کا اہل بناتا ہے، تاہم افسانے کا انجام مبہم ہے، 'پھولوں کو مالی کا ڈراوا دے کر متحد نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح چنبیلی، ترغیب و تحریص کا ذریعہ تو ہے، مگر اس کی مخصوص سیاسی یا سماجی معنویت کیا ہے؟ میرے خیال میں یہاں اشارہ انگیزی کی ضرورت تھی، 'سڑک کے کنارے' 'فرشتہ' اور 'پھندنے' انتہائی پیچیدہ نفسی اور معاشرتی صورتِ حال کے افسانے ہیں، اور اہم بات یہ ہے کہ منٹو نے اس کے اظہار کے لیے اپنے روایتی اسلوب سے انحراف کیا ہے، 'سڑک کے کنارے' کی متکلم ایک عورت ہے، جو محبوبہ اور پھر ماں ہے، لیکن ان دو حیثیتوں پر مقدم اس کا سماجی وجود ہے، جو ناجائز بچے کی ماں کا روپ برداشت نہیں کر سکتا، افسانے کے اختتام سے پہلے تک کہانی کی زبان کسی حد تک نئے اظہاری منطقے کا سفر کرتی دکھائی دیتی ہے، (اس پس منظر میں بھی کہ منٹو کے بہت کم افسانوں میں خود کلامی ملتی ہے)

—— زندگی اور موت کی سرحد ٹوٹ پھوٹ جائے، ارادہ، عمل اور خیال ایک ہو جائے، خواب میں بیداری شامل ہو جائے، موجود اور موہوم گھل مل جائے، بھوک، مفلسی اور بیماری کے ستائے مریض کی جواں بیوی سے ڈاکٹر کی سرگوشیاں، فرشتۂ اجل کی آہٹوں میں مدغم ہو جائیں تو جو پیچیدہ اور تہہ دار فضا بنتی ہے، وہ فرشتہ کی فضا ہے، اس افسانے میں تجرید اور شعور کی رو کی تکنیک کے باوجود سماجی حقائق کے ہیولے منڈلاتے دکھائی دیتے ہیں، جدید اُردو افسانے کا معروف اسلوب، منٹو کے اسی افسانے کی کوکھ سے برآمد ہوا ہے، —— میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ 'پھندنے' میں اپنی دانست میں منٹو نے کہانی کی نئی تجریدی تکنیک کا مذاق اڑانا چاہا تھا، مگر یہ اور بات ہے کہ بالائی طبقے کی کھوکھلی، لایعنی زندگی اور فطری زرخیز کو چلتے رہنے کے موانعات کے نتیجے میں اُبھرنے والا پلاسٹک کلچر اسی تکنیک کے ذریعے ہی بھرپور طریقے سے ظاہر ہو سکتا تھا۔۔۔۔

عام طور پر طرارانیت، چونکانے کی آرزو اور غیر متوقع انجام منٹو کے سٹائل کے بنیادی اوصاف قرار دیئے جاتے ہیں، تاہم واقعہ یہ ہے کہ منٹو کا بنیادی وصف IRONY ہے، دوسرے منٹو کو غیر معمولی کرداروں اور غیر معمولی واقعات سے دلچسپی تھی، سنسنی خیزی، چونکانے کی آرزو اور بلند آہنگی اسی سے مشروط ہے۔